اسلامی تحریک
سفر اور سمتِ سفر

ڈاکٹر محمد رفعت

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

زیر نظر کتاب دراصل ماہ نامہ زندگی نو نئی دہلی میں اداریوں (اشارات) کی شکل میں شائع ہونے والے نو (۹) مضامین کا ایک انتخاب ہے۔ ان میں تحریک اسلامی کے مزاج اور خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بدلتے ہوئے حالات میں اس کے فرائض منصبی کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔

اس دنیا میں امت مسلمہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو حق کی طرف بلائے، انھیں نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے، لیکن افسوس کہ امت کی بڑی تعداد نے اس ذمہ داری کو بھلا دیا ہے اور اپنے مشن سے غافل ہوگئی ہے۔ تحریک اسلامی کا کام یہ ہے کہ وہ امت کو اس کا منصب یاد دلائے اور منصبی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اس کی تربیت کرے۔

ان مضامین میں تحریک اسلامی کے امتیازات وخصوصیات سے بحث کی گئی ہے، مسلم معاشرہ میں اس کی ترجیحات کی نشان دہی کی گئی ہے، اس کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ عالمی سطح پر اور خاص طور پر عالم اسلام کی تعمیر میں آئندہ اس سے کیا توقعات وابستہ ہیں؟ موجودہ حالات میں اس کے لیے صحیح طریقۂ کار واضح کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ علوم و

فنون کی تدوینِ نو کن بنیادوں پر کرنی چاہیے؟ انسانی سماج سے اشتراکِ عمل کے بنیادی نکات کیا ہوں؟ اور سماجی و سیاسی اصلاح کی کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟

اس کتاب سے امتِ مسلمہ سے تحریک اسلامی کے تعلق کی نوعیت واضح ہوتی ہے اور تحریکی کارکنوں کو نئے حالات میں کام کرنے کا جذبہ فراہم ہوتا ہے۔ امید ہے، ان کی جانب سے اس کتاب کا استقبال کیا جائے گا اور وہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔

محمد رضی الاسلام ندوی
سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند

۲۲/ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۶ھ
۱۲/ اپریل ۲۰۱۵ء

اُمت کا فرضِ منصبی

ہم تاریخ کے جس مرحلے میں ہیں، اس میں 'تحریکِ اسلامی' سے مراد وہ کوشش ہے جو اُمتِ مسلمہ کو اُس کے حقیقی منصب پر فائز کرنے کے لیے کی جائے۔ امت کا حقیقی منصب 'شہادت علی الناس' ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں اس کی ضرورت رہتی ہے کہ اُمت کو اُس کا منصب یاد دلایا جائے اور اپنے منصبی تقاضوں کے پورا کرنے کے لیے اُس کی تربیت کی جائے۔ یہی کوشش 'تحریکِ اسلامی' ہے۔

قرآنی تعبیر

قرآنِ مجید میں اُمت کے اندر ایک ایسے گروہ کا تذکرہ کیا گیا ہے جو اُمت کو راہِ راست پر قائم رکھنے کی مسلسل کوشش کرتا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

(آل عمران: ۱۰۴)

"اور ایسا ہونا چاہیے کہ رہے تم میں ایک ایسی جماعت جو نیکی کی طرف بلائے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

اِس آیت کے مخاطب سارے اہلِ ایمان ہیں۔اُن کے اجتماعی شعور سے یہ توقع کی گئی ہے کہ اُن میں ایک ایسا گروہ ضرور موجود رہے گا جو اُمت کو راہِ راست پر قائم رکھے۔تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمت کے اجتماعی شعور نے یہ توقع ہمیشہ پوری کی ہے اور تاریخ کے ہر دور میں اُمت کے اندر ایسی کوششیں ہوتی رہی ہیں، جن کا مطمحِ نظر اُمت کو دین پر قائم رکھنا رہا ہے۔ایسی کوششوں کو ہم 'تحریکِ اسلامی' کہتے ہیں۔تحریک اسلامی کے تین کام، جو اِس آیت میں بتائے گئے ہیں، وہ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہیں۔ظاہر ہے کہ ان عظیم الشان امور کی انجام دہی ایسے ہی لوگ کرسکتے ہیں، جو اعلیٰ ایمانی واخلاقی اوصاف کے حامل ہوں۔چنانچہ قرآنِ مجید میں 'تحریکِ اسلامی' کی درجِ ذیل تعبیر سامنے آتی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُونَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُورَ ۝ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ إِنَّهٗ غَفُورٌ شَكُورٌ ۝ وَالَّذِيٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيرٌۢ بَصِيرٌ ۝ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ۝ (الفاطر:۲۹۔۳۲)

"جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں، وہ ایک ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس میں خسارہ نہ ہوگا۔تاکہ اللہ اُن کو پورا اجر دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے۔بے شک وہ بخشنے والا اور قدرداں ہے۔ہم نے جو کتاب تم پر اتاری ہے وہ سراسر حق ہے اور پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔بے شک اللہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے کچھ کو منتخب کرکے کتاب کا وارث بنادیا۔اُن میں کوئی تو ایسا ہے جو اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے،

کسی کا رویہ بیچ والا ہے اور کوئی نیکیوں میں سبقت لے جانے والا ہے۔ اللہ کے اِذن سے۔ یہی بڑا فضل ہے۔"

مندرجہ بالا آیات میں اُمت کے جن لوگوں کو 'سابق بالخیرات' کہا گیا ہے، وہی اس کے اہل ہیں کہ 'تحریکِ اسلامی' کہلائیں۔ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے کام انجام دینے کی صلاحیت رکھنے والے لوگ ہیں۔

تحریکِ اسلامی اور امتِ مسلمہ کا تعلق

مندرجہ بالا تعبیر سے تحریک اور امت کا تعلق بھی سامنے آجاتا ہے۔ جو لوگ 'سابق بالخیرات' ہیں، وہ آگے بڑھتے ہیں اور نیکیوں کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ وہ بقیہ امت کے لیے مثال اور نمونہ بن جاتے ہیں اور اُن کی کیفیت 'ہراول دستے' جیسی ہوتی ہے۔ باقی امت اُن کا ساتھ دیتی ہے، یا کم ازکم اُس کے ایمانی شعور کا تقاضا یہی ہے کہ اُن کا ساتھ دے۔ اگر 'تحریک اسلامی' فی الواقع تحریکِ اسلامی ہے تو اُمت کے صالح افراد، خواہ تیز رو ہوں یا سُست رو، اس کے ساتھ آئیں گے اور اُس کی تائید کریں گے۔ اُس کی مخالفت کرنے والے وہی ہوں گے جو نفاق کا شکار ہو گئے ہیں یا مفاد پرستی نے اُن کو حق سے بے گانہ کردیا ہے۔ تحریکِ اسلامی اور امتِ مسلمہ کے اِس تعلق کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ امتِ مسلمہ کی صالح لیڈرشپ کا نام 'تحریکِ اسلامی' ہے۔ یہ لیڈرشپ راستہ سجھاتی ہے، راستے نکالتی ہے، رہ نمائی کرتی ہے، راہیں ہموار کرتی ہے اور ہر قدم پر یہ واضح کرتی ہے کہ نت نئے حالات کے اندر معروف کیا ہے اور منکر کیا؟ اور پوری امت کو اپنے منصب پر فائز کرنے اور راہِ راست پر قائم رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ اس طرح 'تحریکِ اسلامی' کا مقام امت کے قائد یا رہ نما گروہ کا قرار پاتا ہے۔

تحریکِ اسلامی کے امتیازات

امتِ مسلمہ کے قائد یا رہ نما کا رول ادا کرنے والی اس تحریک کی پانچ اہم امتیازی خصوصیات ہیں، جن کو ان عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے:

(الف) مستند ماخذ پر اصرار (Authenticity)
(ب) اخلاص وللّٰہیت (Sincerity)
(ج) صبر واستقامت (Perseverance)
(د) ایثار وقربانی (Sacrifice)
(ہ) عصری آگہی (Relevance)

مستند ماخذ پر اصرار

تحریکِ اسلامی کی یہ بنیادی خصوصیت ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کو دین کے مستند ماخذ 'قرآن وسنت' کی طرف شعوری رجوع کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ اصولی طور پر اِس معاملے میں اُمت کے اندر دو رائیں نہیں ہیں کہ قرآن وسنت ہی دین کے مستند ماخذ ہیں، لیکن اِس اصولی موقف کے عملی انطباق میں کوتاہی ہوسکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے مستند ماخذ پر اصرار کے مندرجہ بالا اصول کے جو تقاضے 'تحریکِ اسلامی' نے سمجھے ہیں اُن کی نشان دہی بھی ضروری ہے:

(۱) امت کو رہ نمائی کے لیے استفادہ صرف قرآن وسنت سے کرنا چاہیے اور باطل فلسفوں اور نظریات کی طرف بہ غرضِ استفادہ، نگاہ نہیں ڈالنی چاہیے۔ اس معاملے میں امت کا دانش ور طبقہ، اس وقت بڑی بے راہ روی کا شکار ہے۔ اس صورت حال کی اصلاح ضروری ہے۔

(۲) قرآن وسنت سے درست استفادے کی صلاحیت امت کے اہلِ علم طبقے کو اپنے اندر پروان چڑھانی چاہیے اور استفادے کی ضروری شرائط پوری کی جانی چاہئیں۔ اس وقت یہ صلاحیت دانش ور کہلائے جانے والے طبقے میں بہت کم ہے اور روایتی علماء کے گروہ میں معیارِ مطلوب کے مطابق نہیں ہے۔

(۳) امت کے ماضی کا اور ماضی کی تمام علمی آراء کا تنقیدی جائزہ لیا جانا چاہیے اور اس میں پوری احتیاط کے ساتھ ترک واخذ کا کام کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کا پورا ماضی جوں کا توں قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس سلسلے میں فقہ، تصوف اور علم الکلام سب پر تنقیدی غور وفکر کی ضرورت ہے۔

(۴) دین کے مستند ماخذ۔قرآن وسنت۔سے استفادے کے سلسلے میں امت کے اہلِ علم

طبقے کے درمیان بامعنی گفتگو، مکالمہ اور مذاکرے کا سلسلہ شروع ہونا چاہیے، تاکہ جن رویوں کو 'مکاتبِ فکر' کہا جاتا ہے اُن کی بے لچک (Rigid) دیواریں ٹوٹیں اور باہم تبادلہ خیال کے بعد امت 'اجماع' (Consensus) کی طرف قدم بڑھا سکے۔ مطلوب یہ ہے کہ افرادِ امت اپنے آپ کو 'مکاتبِ فکر' سے منسوب کرنے کے بجائے صرف اسلام سے منسوب کریں۔ نتیجہ خیز تبادلہ خیال کے بعد ہی یہ فضا پیدا ہو سکتی ہے۔

اخلاص وللّٰہیت

یہ تحریک اسلامی کی دوسری خصوصیت ہے۔ اسے جو 'مزاج' افرادِ تحریک اور امتِ مسلمہ کے اندر پیدا کرنا ہے، وہ اخلاص کا مزاج ہے، یعنی تمام نیک کام صرف اللہ کی رضا کے لیے انجام دیے جائیں اور کسی کام کے کرنے یا اُس سے باز رہنے کا محرک صرف اللہ کی رضاجوئی کا جذبہ اور اس کی باز پرس سے بچنے کا داعیہ ہو۔ اخلاص وللّٰہیت کا یہ اہتمام ذاتی مفاد سے افراد کو بے نیاز کردیتا ہے اور اس بے نیازی کا حصول زیادہ دشوار نہیں ہے، لیکن اخلاص وللّٰہیت کے منافی بعض دوسرے جذبات بھی ہیں اور اُن پر قابو پانے کے لیے زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اُن میں ایک نامطلوب جذبہ 'تنظیم' کے لیے کام کرنے کا ہے۔ آدمی بسا اوقات اپنے لیے تو کچھ نہیں چاہتا، نہ نام و نمود نہ دولت اور وسائل اور نہ جاہ واقتدار، مگر اپنی 'تنظیم' کے لیے یہ سب کچھ چاہتا ہے اور ان 'مطلوب' چیزوں کے حصول کے لیے اصولوں کی قربانی میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ 'تحریکِ اسلامی' کا مطلوبہ مزاج یہ چاہتا ہے کہ ذاتی مفاد کی طرح انسان اِس 'تنظیمی مفاد' سے بھی بے نیاز ہوجائے اور صِرف اللہ کے لیے کام کرے۔ اخلاص وللّٰہیت کی صفت تمام افراد میں مطلوب ہے اور جن کے کاندھوں پر رہنمائی کا جتنا زیادہ بار ہے ان کے اندر یہ صفت اتنی ہی زیادہ مطلوب ہے۔

صبر واستقامت

تحریک اسلامی کے سیاق میں صبر واستقامت کے وصف کے معنیٰ یہ ہیں کہ 'درست موقف' پر قائم رہا جائے اور اس سے انحراف نہ کیا جائے۔ اس معاملے میں دو رویّوں کے درمیان

باریک فرق کرنا ہوتا ہے اور اکثر یہ کام دشوار ثابت ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک موقف اختیار کرتے ہیں اور بعد کے کسی مرحلے میں مزید غور وفکر کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ اس موقف میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس شعور کے بعد بھی اسی سابقہ موقف پر جمے رہنا اور اس میں ضروری اصلاح نہ کرنا ایک غلط رویہ ہے۔ اس کو جمود یا Rigidity کہا جاسکتا ہے۔ یہ صبر و استقامت نہیں ہے۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے سابقہ موقف پر 'جمے رہنا' حالات کے ناموافق ہونے کی بنا پر دشوار محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس موقف پر قائم رہیں گے تو مخالفتوں سے سابقہ پیش آئے گا، آزمائشیں آئیں گی اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا، اس لیے اس موقف میں کچھ 'لچک' پیدا کر لینی چاہیے۔ یہ خیال محض ذاتی آزمائشوں کی بنا پر نہیں آتا، بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ امت یا تنظیم دشواریوں میں پڑ جائے گی۔ اس طرح کے خیالات کی بنا پر درست موقف کو بدلنا صبر واستقامت کے خلاف ہے۔ بہت باریک بینی کے ساتھ اس امر کا جائزہ لے کر تحریک کو چاہیے کہ ہر طرح کی دشواریوں کے باوجود حق پر اور اس کے تقاضوں پر قائم رہے۔

ایثار وقربانی

'سابق بالخیرات' ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ نیکیوں میں سبقت کی جائے، سرگرمی دکھائی جائے، اوقات، صلاحیتوں اور وسائل کو اللہ کی راہ میں استعمال کیا جائے اور چستی و مستعدی سے کام کیا جائے۔ یہ سارے اوصاف ایثار وقربانی کا تقاضا کرتے ہیں۔ صبر واستقامت کے وصف سے 'ایثار' کے وصف کا گہرا تعلق ہے۔ جب افراد اور اجتماعیتیں حق پر قائم رہتی ہیں تو اُن پر آزمائشیں بھی آتی ہیں۔ تحریکِ اسلامی کا مزاج یہ ہے کہ آزمائشوں کو دعوت نہ دی جائے، حکمت اور دانش مندی کے ساتھ کام کیا جائے اور راہیں نکالی جائیں، لیکن اسی مزاج کا تقاضا یہ بھی ہے کہ آزمائش آجائے تو استقامت کا مظاہر کیا جائے اور حق پر جم جایا جائے۔ ایثار وقربانی کی ضرورت ہر مرحلے میں ہے، لیکن خاص طور پر آزمائش کے دور میں ایثار وقربانی ناگزیر ہے۔ اس کے چند تقاضے درج ذیل ہیں:

(۱) ہنگامی اور نازک حالات میں بھی تحریک کو جاری رکھا جائے۔اس کے لیے پہلے سے منصوبہ بندی کی جائے اور وسائل فراہم کیے جائیں۔

(۲) جو افرادِ تحریک اور افرادِ امت راہِ حق میں آزمائشوں سے دوچار ہوں، اُن کی ہمت بندھائی جائے، اُن کا ساتھ دیا جائے اور اُن کی ہر ممکن مدد کی جائے۔

(۳) تحریک اور اُمت کا اجتماعی ماحول ایسا بنایا جائے جہاں افراد ایک دوسرے کے بہی خواہ، ہمدرد اور پشت پناہ ہوں۔

اس پہلو سے تحریک اور امت کی اس وقت کی صورتِ حال تشویش ناک ہے۔ ہمارا طرزِ عمل برادرانہ ہونے کے بجائے بسا اوقات دفتری اور رسمی تعلق کا ہوتا ہے۔اس کی اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ایثار و قربانی دعوت و اصلاح کے میدان میں بھی ضروری ہے اور راہِ حق کے رفقاء کی خبر گیری کے لیے بھی۔ ان دونوں پہلوؤں پر توجہ کی جانی چاہیے۔

عصری آگہی

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام یہ چاہتا ہے کہ 'معروف کیا ہے اور منکر کیا؟' اصولاً اس کی صحیح معرفت ہمیں حاصل ہو۔ دوسری طرف یہ کام یہ بھی چاہتا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں ان اصطلاحات کا اطلاق کن امور پر ہوتا ہے، اس کا بھی صحیح شعور ہو۔ اس دوسرے پہلو کو 'عصری آگہی' کہا جاسکتا ہے۔ اس آگہی کی موجودگی تحریک کو بامعنی بناتی ہے اور نتیجتاً تحریک انسانوں کے لیے مفید ہوتی ہے۔ ورنہ اس کے بے معنی (Irrelevant) ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام محض سادہ طور پر تلقین کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ کام 'اجتہاد' چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر آج کی دنیا کے سامنے یہ سوال ہے کہ 'بایوٹیکنالوجی' کے میدان میں وہ اخلاقی اصول کیا ہیں، جن کی پابندی اہلِ تحقیق کو کرنی چاہیے؟ اجتہاد کے بغیر مسلمان اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ البتہ اگر مسلمان اہلِ علم محنت کر کے اس سوال کا جواب دریافت کریں تو وہ انسانیت کی بڑی خدمت کریں گے اور یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے کی انجام دہی ہوگی۔

عملی سوالات

تحریکِ اسلامی کے اس اصولی تعارف کے بعد بعض عملی سوالات سامنے آتے ہیں:

(۱) تحریک اسلامی کی امتیازی خصوصیات کیسے قائم رکھی جائیں؟

(۲) امت کے اندہو رہے دوسرے کاموں سے تحریک کا کیا تعلق ہونا چاہیے؟

(۳) تحریکِ اسلامی کی ترجیحات کیا ہوں؟

امتیازی خصوصیات کا بقا

تحریک اسلامی کی امتیازی خصوصیات برقرار رکھنے کی تدابیر بنیادی طور پر تین ہیں:

(۱) افرادِ تحریک انفرادی اور اجتماعی طور پر قرآن مجید سے زندہ تعلق قائم کریں۔ تحریکاتِ اسلامی کے قدیم اور جدید لٹریچر کا قرآنِ مجید کی روشنی میں مطالعہ کریں، اِس لٹریچر کا تنقیدی جائزہ لیں اور صحت مند علمی تبادلہ خیال کا ماحول پیدا کریں۔ اس ضمن میں یہ ضروری ہے کہ ایسے اجتماعی پروگراموں کا اہتمام کیا جائے جہاں قرآنِ مجید کا اجتماعی مطالعہ ہو اور امور ومسائل پر قرآن کی روشنی میں غور وفکر کیا جائے۔

(۲) دوسری ضروری تدبیر 'رفاقت' ہے۔ صالح صحبت کا اہتمام کیا جائے اور تحریک کے اجتماعی ماحول میں ایسی خرابیوں کا وجود گوارا نہ کیا جائے جو اسلامی کردار کے منافی ہیں، مثلاً غیبت، سوئے ظن، تکبّر وغیرہ۔

(۳) تیسری ضروری تدبیر احتساب ہے، جو ہر سطح پر ہونا چاہیے۔ احتساب کے بعد جو انفرادی واجتماعی خرابیاں سامنے آئیں اُن کے سلسلے میں کوئی نرمی نہیں برتی جانی چاہیے۔

اس وقت احتساب کا نظام بہت توجہ کا طالب ہے۔ ضروری ہے کہ اس کو فعال، کارگر اور چست بنایا جائے۔ اس کے لیے رسمی اور غیر رسمی دونوں طریقے اختیار کیے جائیں۔

امت کی اصلاحی کوششیں اور تحریکِ اسلامی

امت کے اندر جو اصلاحی کام ہو رہے ہیں، اصولاً ان کا اور تحریک اسلامی کا تعلق 'تعاون' کا ہے۔ اس لیے کہ جو لوگ 'سابقون بالخیرات' ہوں اُن کو تمام نیک کاموں میں تعاون کرنا چاہیے۔ البتہ بعض عارضی وجوہ کی بنا پر تعاون کے بجائے 'ٹکراؤ' کی فضا وجود میں آسکتی ہے۔ یہ وجوہ دو ہو سکتی ہیں:

(الف) نقطۂ نظر کا اختلاف

(ب) تنظیمیت

مذکورہ بالا دونوں وجوہ پر قابو پانا ضروری ہے۔ اگر دو دینی تنظیموں کا کسی معاملے میں نقطۂ نظر مختلف ہے تو انہیں اپنا نقطۂ نظر دلائل کے ساتھ بیان کرنا چاہیے، لیکن اس کے باوجود اگر اختلاف دور نہ ہو تو اُس اختلاف کو گوارا کرتے ہوئے انہیں باہم تعاون کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے تحریکِ اسلامی کو آگے بڑھ کر یہ رویہ اپنانا چاہیے۔ رہی 'تنظیمیت'، یعنی 'تنظیم کے لیے کام کرنا' (نہ کہ رضائے الٰہی کے لیے) تو یہ ایک نامطلوب وصف ہے اور تمام دینی تنظیموں کو چاہیے کہ اس پر قابو پائیں۔

امت کے ادارے

اُمت کی عمومی مصلحت کا تقاضا ہے کہ امت میں جو ادارے تعلیمی یا رفاہی خدمات انجام دے رہے ہوں، وہ کسی تنظیم کے تحت نہ ہوں، بلکہ رسماً بھی آزاد ہوں اور عملاً بھی۔ اس طرح وہ ادارے بہتر خدمت انجام دے سکیں گے۔ اُن کی کارکردگی میں اضافہ ہوگا اور اُمت کے اندر تعاونِ باہمی کا جو ماحول مطلوب ہے وہ ماحول پروان چڑھے گا۔

ترجیحات

تحریکِ اسلامی کا میدانِ کار پوری امت اور پوری انسانیت ہے۔ اگر یہ تحریک ہر قسم کے کاموں کو عملاً اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے تو اس کی قوتیں اس کے لیے کفایت نہیں

کریں گی اور اس کی کارکردگی متاثر ہوگی۔ اس لیے تحریکِ اسلامی کے لیے ضروری ہے کہ اپنی ترجیحات طے کرے۔ اس سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ امت انسانیت کی رہ نما ہے اور تحریکِ اسلامی امت کی رہ نما ہے۔ اِس لیے تحریک کی توجہ کا اولین مرکز اُس کا 'رہ نمایانہ رول' ہونا چاہیے۔ تحریکِ اسلامی کو کوشش یہ کرنی چاہیے کہ امتِ مسلمہ کو دین کے ضروری امور کی انجام دہی کے لیے آمادہ کیا جائے، بجائے اس کے کہ تحریک خود سارے کام کرنے کی کوشش کرے۔

تحریک کو جو کام خود کرنے چاہئیں وہ درجِ ذیل ہیں:

(الف) بدلتے ہوئے حالات میں امت کی صحیح رہ نمائی کرنا، جو امت کے منصب کے شایانِ شان ہو۔

(ب) امت کی اجتماعی سرگرمیوں اور اداروں کے لیے اسلامی بنیادوں پر درست 'خطوطِ کار' تجویز کرنا اور امت میں ان کی ترویج کی کوشش کرنا۔

(ج) امت کے مسائل سے نبٹنے کے لیے جن نئے کاموں اور جن نئے اداروں کی ضرورت ہو، ان کے آغاز کی تحریک کرنا۔

(د) غیر مسلم حکومتوں اور اداروں سے صحیح تعلق کے سلسلے میں امت کی رہ نمائی کرنا۔

(ہ) امت کی دعوتی کاوشوں کو مربوط کرنا اور صحیح رخ دینا۔

(و) انسانی دنیا کی تبدیلیوں کا جائزہ لے کر معروف و منکر کا تعین کرنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا۔

بقیہ تمام تعلیمی و رفاہی کاموں کو امت کے سپرد کرنا چاہیے۔ ان کاموں کے لیے ضروری ادارے قائم کرنے کی طرف متوجہ کرنا چاہیے اور تحریک کو کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی توانائیاں براہِ راست ان کاموں میں نہ لگائے، بلکہ رہ نمائی اور ترغیب پر اکتفا کرے۔ تحریک کی براہِ راست توجہ کا مرکز صرف وہ امور ہونے چاہئیں جو تحریک کے رہ نمایانہ رول کا تقاضا ہیں۔

انکارِ حق کے محرّکات

جولوگ دعوت واصلاح کا کام کرتے ہیں، اُن کو یہ سوال اکثر پریشان کرتا ہے کہ راہِ حق واضح ہوجانے کے بعد بھی لوگ حق کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ ذیل کی سطور میں یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ قرآنِ مجید اس سوال کا کیا جواب دیتا ہے؟ یعنی قرآنِ مجید کے مطابق کن لوگوں کو ہدایت ملتی ہے اور کون اس سے محروم رہ جاتے ہیں؟

ہدایت اور اِذنِ الٰہی

داعی حق کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تبلیغ کے تمام آداب کا لحاظ رکھے، مخاطب کے ذہن کو سامنے رکھ کر دل نشیں انداز میں دلائل پیش کرے، آفاق وانفس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلا کر حق کو واضح کرے، موعظتِ حسنہ سے کام لے، صبر کے ساتھ مخاطب کے سوالات کو سنے اور اُن کا جواب دے اور اپنی بساط بھر مخاطب پر حجت تمام کردے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود یہ ممکن ہے کہ مخاطب دعوتِ حق کو قبول نہ کرے۔ یہ تجربہ ہر داعی کو ہوتا رہتا ہے۔ ایسی صورتِ حال پیش آنے پر مایوسی کا شکار ہونے کے بجائے داعیِ حق کو یہ حقیقت اپنے ذہن میں تازہ کر لینی چاہیے، کہ کسی شخص کو بہ ہر صورت ہدایت دے دینا اُس کا کام نہیں ہے، بلکہ ہدایت ملنے یا نہ ملنے کا تعلق اللہ کی مشیت سے ہے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ○ (القصص:۵۶)

’’آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے، جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں۔‘‘

اس بنیادی حقیقت کے سامنے آجانے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہدایت سے متعلق مشیتِ الٰہی جس سنت کے تحت کام کرتی ہے وہ کیا ہے اور اس کے مطابق کون لوگ ہدایت سے فیض یاب ہوتے ہیں اور کن لوگوں کو ہدایت نہیں ملتی؟

ہدایت پانے والے

قرآنِ مجید انسانوں کو اُن کی سعی و جہد کے مطابق دو قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ اُن میں سے ایک قسم اُن اِنسانوں کی ہے، جن کے لیے راہِ راست پالینا آسان ہوتا ہے:

اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰیؕ ۝ فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَاتَّقٰیۙ ۝ وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰیۙ ۝ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰیؕ ۝ (الیل: ۴ـ۷)

’’درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں تو جس نے (راہِ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا اور بھلائی کو سچ مانا اُس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔‘‘

ان آیات میں راہِ راست پانے والوں کی تین اعلیٰ انسانی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے:

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آدمی زر پرست نہ ہو، بلکہ بھلائی کے کاموں میں مال خرچ کرنے کے لیے تیار ہو۔ جو شخص خرچ کرنے کے مواقع پر مال کو صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا وہ دراصل اپنے انسانی مرتبے سے گرجاتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا اور اُس کے وسائل کو تو اللہ نے اُسے اسی لیے بخشا تھا کہ وہ بہ وقتِ ضرورت اُن سے صحیح کام لے۔ اَب اگر وہ ان وسائل پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اُن کو صحیح مصرف میں نہیں آنے دیتا تو وہ گویا اپنے اعلیٰ انسانی مقام کی خود نفی کر دیتا ہے۔ اِس کے برعکس جو شخص مال کو بھلے کاموں میں خرچ کرتا ہے، وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ دنیا اور اُس کے وسائل کی صحیح پوزیشن سے آگاہ ہے، یعنی اس حقیقت سے باخبر ہے کہ دنیا کے وسائل اُس کو

بھلے کاموں میں استعمال کرنے کے لیے دیے گئے ہیں۔ جو شخص اِس اعلیٰ انسانی صفت کا مظاہرہ کردے اُس کے لیے ہدایت کے راستے یقیناً کھل جانے چاہئیں۔

دوسری انسانی صفت جس کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تقویٰ ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ بقرہ کے آغاز میں کتابِ الٰہی کا تعارف کراتے ہوئے کہی گئی ہے: هُدًى لِلْمُتَّقِينَ "یہ کتاب ہدایت ہے، پرہیز گار لوگوں کے لیے۔" مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس کے ذیل میں فرماتے ہیں:

> "(تقویٰ کی صفت سے مراد یہ ہے کہ) آدمی پرہیز گار ہو، بھلائی اور برائی میں تمیز کرتا ہو، برائی سے بچنا چاہتا ہو، بھلائی کا طالب ہو اور اس پر عمل کرنے کا خواہش مند ہو۔ رہے وہ لوگ جو دنیا میں جانوروں کی طرح جیتے ہوں، جنہیں کبھی یہ فکر لاحق نہ ہوتی ہو کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں، بس جدھر دنیا چل رہی ہو، یا جدھر خواہشِ نفس دھکیل دے، یا جدھر قدم اٹھ جائیں، اُسی طرف چل پڑتے ہوں، تو ایسے لوگوں کے لیے قرآن میں کوئی رہ نمائی نہیں ہے۔"

(تفہیم القرآن، سورۂ البقرۃ، حاشیہ: ۳)

ہدایت پانے کے لیے تیسری صفت، جس کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی حق اور راستی کا قدرداں ہو۔ جب حق اُس کے سامنے آئے تو وہ اسے ایک قیمتی متاع سمجھے اور شوق و ذوق کے ساتھ اُس کی طرف لپک پڑے اور جب سچائی اُس پر کھل جائے تو وہ پوری جرأت کے ساتھ اُس کی تصدیق کرے۔ رہے وہ لوگ جو حق کو حق ماننے سے 'نفع و نقصان' کا حساب لگائیں اور اگر اُن کی کوتاہ بیں آنکھوں کو قبولِ حق کے راستے میں دنیا کا ظاہری گھاٹا نظر آئے تو حق سے منھ پھیر لیں تو ایسے لوگ یقیناً ہدایت کے مستحق نہیں ہیں۔ داعیِ حق کی بات اُن کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ؎

عشق فرمودۂ قاصد پہ سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

ہدایت سے محروم رہنے والے

سطورِ بالا میں ہدایت پانے والوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ یہ ایک قِسم کے انسان ہیں۔ انسانوں کی دوسری قِسم وہ ہے جو ہدایت سے محروم رہتی ہے۔ یہ محرومی بلاوجہ نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ اُن کی اپنی مساعی ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۙ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۙ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ۭ۝ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ۭ۝ (الیل:۸-۱۱)

''اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا، اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے۔ اور اُس کا مال آخر اُس کے کس کام آئے گا، جب کہ وہ ہلاک ہو جائے۔''

بخل، حق سے بے نیازی اور بھلائی کو جُھٹلانا، یہ وہ ناپسندیدہ صفات ہیں جو انسان کو ہدایت سے محروم رکھتی ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ان صفات کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بخل سے مراد محض وہ بخل نہیں ہے جس کے لحاظ سے عام طور پر لوگ اُس آدمی کو بخیل کہتے ہیں جو روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھتا ہے اور اُسے نہ اپنے اوپر خرچ کرتا ہے، نہ اپنے بال بچوں پر، بلکہ اِس جگہ بخل سے مراد راہِ حق میں اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مال صَرف نہ کرنا ہے اور اِس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنی ذات پر، اپنے عیش و آرام پر، اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر تو خوب دل کھول کر مال لٹاتا ہے، مگر کسی نیک کام کے لیے اُس کی جیب سے کچھ نہیں نکلتا، یا اگر نکلتا بھی ہے تو یہ دیکھ کر نکلتا ہے کہ اس کے بدلے میں اُسے شہرت، نام و نمود، حکام رَسی، یا کسی اور قسم کی منفعت حاصل ہوگی۔ بے نیازی برتنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی دنیا کے مادّی فائدوں ہی کو اپنی ساری تگ و دو اور محنت اور کوشش کا مقصود بنا لے اور خدا سے بالکل مستغنی ہو کر اس بات کی کچھ پروا نہ کرے کہ کس کام سے وہ خوش اور کس کام سے وہ ناراض ہوتا ہے۔ رہا بھلائی کو جُھٹلانا، تو وہ اپنی تمام تفصیلات میں بھلائی کو سچ ماننے کی ضد ہے۔''

(تفہیم القرآن، سورۂ لیل، حاشیہ: ۴)

استکبار

ہدایت سے محرومی کا ایک سبب استکبار اور غرورِ نفس ہے۔ قرآنِ مجید میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (الاعراف: ۳۵،۳۶)

''اے اولادِ آدم! اگر تمہارے پاس پیغمبر آئیں، جو تم ہی میں سے ہوں گے، جو میرے احکام تم سے بیان کریں گے تو جو شخص پرہیزگاری اختیار کرے اور اِصلاحِ احوال کرے تو ایسے لوگوں پر نہ کچھ اندیشہ ہے اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔ اور جو لوگ ہمارے اِن احکام کو جھوٹا بتائیں گے اور اُن سے تکبّر کریں گے، وہ لوگ دوزخ والے ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ○ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ○

(الاعراف: ۴۰،۴۱)

''اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں اور اُن (کے ماننے) سے تکبّر کرتے ہیں، اُن کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور وہ لوگ کبھی جنت میں نہ جائیں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے کے اندر سے نہ چلا جائے اور ہم مجرم لوگوں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ اُن کے لیے (آتشِ) دوزخ کا بچھونا ہوگا اور اُن کے اوپر (اُسی کا) اوڑھنا ہوگا اور ہم ایسے ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔''

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ○ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ○ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ○ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ○ (الاعراف:۱۳۰-۱۳۳)

''ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید اُن کو ہوش آئے۔ مگر اُن کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اِسی کے مستحق ہیں اور جب بُرا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کو اپنے لیے فالِ بدٹھہراتے، حالاں کہ درحقیقت اُن کی فالِ بد تو اللہ کے پاس تھی، مگر اُن میں سے اکثر بے علم تھے۔ انھوں نے موسیٰ سے کہا: تو ہمیں مسحور کرنے کے لیے خواہ کوئی نشانی لے آئے، ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ آخر کار ہم نے اُن پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل چھوڑے، سرسریاں پھیلائیں، مینڈک نکالے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں، مگر وہ تکبر کرتے رہے اور وہ لوگ تھے ہی جرائم پیشہ۔''

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ○ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ○ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ○ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ○
(النحل:۲۰-۲۳)

''اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں، بلکہ خود مخلوق ہیں۔مُردہ ہیں نہ کہ زندہ اور اُن کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ انہیں کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا جائے گا۔تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے، اُن کے دلوں میں انکار بس کر رہ گیا ہے اور وہ گھمنڈ میں پڑ گئے ہیں۔اللہ یقیناً ان کے سب کرتوت جانتا ہے۔چھُپے ہوئے بھی اور کھلے ہوئے بھی۔وہ ان لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرورِ نفس میں مبتلا ہوں۔''

مستکبرین کی پیروی

یہ ایک مخصوص انسانی کردار ہے جس کا تذکرہ درجِ بالا آیات میں کیا گیا ہے۔اس کردار کے حاملین تکبر اور غرورِ نفس کی بنا پر ہدایت الٰہی کا انکار کرتے ہیں۔اس کردار کے پہلو بہ پہلو ہدایت سے محروم رہ جانے والا ایک اور کردار بھی انسانی سماج میں پایا جاتا ہے۔یہ کردار اُن لوگوں کا ہے جو دنیا میں دَبا کر رکھے گئے تھے (مستضعفین تھے)۔اِن 'دبا کر رکھے گئے لوگوں' نے اپنی عقل سے کام نہیں لیا اور آنکھیں بند کر کے مستکبرین کی پیروی اختیار کر لی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح مستکبرین ہدایت سے محروم رہے تھے، اُسی طرح یہ مستضعفین بھی ہدایت سے محروم رہے۔قرآن مجید میں اِن گھمنڈیوں اور اُن کے اندھے پیروؤں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨالْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ○ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ

مُّجْرِمِيْنَ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○ (سبا:۳۱۔۳۳)

''یہ کافر کہتے ہیں کہ ''ہم ہرگز اِس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اِس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے۔'' کاش! تم دیکھو اِن کا حال اُس وقت جب یہ ظالم اپنے رَب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اُس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے۔ جو لوگ دنیا میں دَبا کر رکھے گئے تھے، وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ ''اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔'' وہ بڑے بننے والے اِن دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے: کیا ہم نے تمھیں اُس ہدایت سے روکا تھا، جو تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔ وہ دبے ہوئے لوگ اِن بڑے بننے والوں سے کہیں گے: نہیں، بلکہ شب و روز کی مکاری تھی، جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اُس کا ہم سر ٹھیرائیں۔ آخرکار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ کیا لوگوں کو اِس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جاسکتا ہے کہ جیسے اُن کے اعمال تھے ویسی ہی جزا وہ پائیں۔''

وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ○ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ

الْعَذَابِ○ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ○

(المؤمن: ۴۷-۵۰)

''پھر ذرا خیال کرو اُس وقت کا جب یہ (منکرینِ حق) دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے۔ دنیا میں جو لوگ کم زور تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ ''(دنیا میں) ہم تمہارے تابع تھے۔اَب کیا یہاں تم نارِ جہنم کی تکلیف کے کچھ حصے سے ہم کو بچا لو گے؟'' وہ بڑے بننے والے جواب دیں گے: ''ہم سب یہاں ایک حال میں ہیں اور اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا ہے۔'' پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنم کے اہل کاروں سے کہیں گے: ''اپنے رَب سے دعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک دِن کی تخفیف کردے۔'' وہ پوچھیں گے: ''کیا تمہارے پاس تمہارے رسول بیّنات لے کر نہیں آتے رہے تھے؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں۔'' جہنم کے اہل کار بولیں گے: ''پھر تو تم ہی دعا کرو اور کافروں کی دعا اَکارَت ہی جانے والی ہے۔''

مذکورہ بالا آیات کا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کم زور لوگوں (مستضعفین) کو بَری الذمہ قرار نہیں دیا ہے۔ بلاشبہ جہاں تک مستکبرین کا تعلق ہے اُن کو اپنی گم راہی کی سزا بھی ملے گی اور دوسروں کو گم راہ کرنے کی بھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کم زور لوگ (جو دَبا کر رکھے گئے تھے) گرفت سے بچ جائیں گے، بلکہ جو گم راہی انھوں نے اختیار کی تھی (خواہ مستکبرین کی پیروی میں کی ہو) اُس کے وہ خود ذِمہ دار ٹھیرائے جائیں گے اور اُس کا خمیازہ اُن کو بھگتنا ہوگا۔ اس طرح قرآن مجید نے انسان کی انفرادی مسئولیت کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ اس تنبیہ کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں ہر شخص آنکھ کھول کر زندگی گزارے اور یہ دیکھے کہ وہ کن لوگوں کی پیروی اختیار کر رہا ہے اور کن کے طریقوں کا اتباع کر رہا ہے۔ آخرت میں وہ اپنی گم راہی کا الزام اپنے رہ نماؤں پر نہیں رکھ سکے گا اور نہ اُن رہ نماؤں کی غلط روی کی دہائی دے کر اپنی سزا میں کچھ کمی کرا سکے گا۔

قرآنِ مجید کی یہ وارننگ کسی بھی انسانی سماج کے ہر طبقے کے شعور کو بیدار کرنے کے لیے کافی ہے۔ بشرطے کہ اس پر دھیان دیا جائے۔

خواہشِ نفس کی پیروی

کسی انسان کی حق سے محرومی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرنا چاہتا ہے۔ وہ راہِ حق کو اختیار نہیں کرتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ راہِ حق پر چلنے میں اس کو اپنی خواہشات پر کنٹرول کرنا ہوگا اور اُن کو شریعتِ الٰہی کے تابع بنانا ہوگا۔ قرآن مجید میں ہے:

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (الروم: ۲۹، ۳۰)

”مگر یہ ظالم بے سمجھے بوجھے اپنی خواہشات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ اَب کون اُس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو۔ ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں ہوسکتا۔ پس (اے نبی اور نبی کے پیروؤ) یکسو ہوکر اپنا رُخ اس دین کی سمت جمادو۔ قائم ہوجاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔“

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ۭ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۣ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ○ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ

صٰدِقِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (القصص:۴۸-۵۰)

''مگر جب ہمارے ہاں سے حق اُن کے پاس آ گیا تو وہ کہنے لگے۔ ''کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟'' کیا یہ لوگ اُس کا انکار نہیں کر چکے ہیں جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ انھوں نے کہا: ''دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔'' اور کہا ''ہم کسی کو نہیں مانتے۔'' (اے نبی!) ان سے کہو ''اچھا تو لاؤ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب جو اِن دونوں (یعنی تورات اور قرآن) سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو۔ اگر تم سچے ہو، میں اسی (کتاب) کی پیروی اختیار کروں گا۔'' اب اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں۔ اور اُس شخص سے بڑھ کر گم راہ کون ہوگا، جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔''

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ○ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○ (المائدۃ:۷۰-۷۱)

''ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور اُن کی طرف بہت سے رسول بھیجے، مگر جب کبھی اُن کے پاس کوئی رسول اُن کی خواہشاتِ نفس کے خلاف کچھ لے کر آیا تو کسی کو انھوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کوئی فتنہ رونما نہ ہوگا، اس لیے اندھے اور بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے انہیں معاف کیا تو اُن میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے بہرے بنتے چلے گئے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔''

تقلیدِ آباء

ہدایتِ الٰہی سے محرومی کا ایک سبب آباء و اجداد کی بلا سوچے سمجھے تقلید ہے۔ آباء و اجداد کی محبت فطری ہے، لیکن انسان کو چاہیے کہ اس محبت کو حق کی محبت پر غالب نہ آنے دے۔ قرآن مجید میں کھانے پینے کے متعلق جاہلی رسوم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○

(المائدۃ: ۱۰۳، ۱۰۴)

’’اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام، مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور اُن میں سے اکثر بے عقل ہیں (کہ ایسے وہمیات کو مان رہے ہیں) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے جائیں گے، خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستے کی انہیں خبر ہی نہ ہو۔‘‘

بعض مشرکین نے ملائکہ کو خدائی میں شریک ٹھیرا رکھا تھا اور اس فعل کے لیے آباء و اجداد کی سند پیش کرتے تھے۔ قرآن نے اِس طرزِ عمل کی نامعقولیت کی طرف توجہ دلائی ہے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ ○ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ

هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ○ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ○ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ○ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ (الزخرف:۱۹-۲۵)

’’انھوں نے فرشتوں کو، جو خدائے رحمان کے خاص بندے ہیں، عورتیں قرار دے لیا۔ کیا اُن کے جسم کی ساخت انھوں نے دیکھی ہے۔ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہ کہتے ہیں کہ ’’اگر خدائے رحمن چاہتا (کہ ہم اُن کی عبادت نہ کریں) تو ہم کبھی اُن کو نہ پوجتے۔‘‘ یہ اس معاملے کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے، محض تیر تکّے لڑاتے ہیں۔ کیا ہم نے اس سے پہلے کوئی کتاب ان کو دی تھی جس کی سند (اپنی اس ملائکہ پرستی کے لیے) یہ اپنے پاس رکھتے ہوں۔ نہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا، اُس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے اُن سے پوچھا: ’’کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے، خواہ میں تمھیں اُس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟‘‘ انھوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ ’’جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو، ہم اس کے کافر ہیں۔‘‘ آخر کار ہم نے اُن کی خبر لے ڈالی اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔‘‘

داعیِ حق کی ذمہ داری

سطورِ بالا میں ہدایت سے محرومی کے چند اسباب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ اسباب ہیں: بخل، حق سے بے نیازی، سچائی کی تکذیب، استکبار اور غرورِ نفس، مستکبرین کی اتباع، خواہشِ نفس کی پیروی اور تقلید آبائی۔ بہ ہر حال سبب کوئی بھی ہو، داعی حق کے لیے مالکِ کائنات کی مستقل ہدایت یہ ہے کہ وہ مایوس ہوئے بغیر اپنا کام جاری رکھے اور منکرین کی روش سے غم زدہ نہ ہو:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ○ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُمْ مُّحْسِنُونَ ○ (النحل: ۱۲۷، ۱۲۸)

''اے نبی! صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ ـــ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے ـــ اِن لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔ اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان کی روش اختیار کرتے ہیں۔''

جماعت اسلامی کی بنیادی خصوصیات

جماعت اسلامی ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی۔ اس تنظیم نے برِصغیر کے علاوہ پوری دنیا کے مسلمان عوام وخواص پر اپنے اثرات ڈالے۔

جماعت اسلامی کے بنیادی لٹریچر کے مطالعے سے اِس جماعت کی پانچ بنیادی خصوصیات ہمارے سامنے آتی ہیں:

(الف) ماضی کی تحریکاتِ اسلامی سے ہم آہنگی کا شعور

(ب) اُمّت کے ساتھ یک جہتی کا احساس

(ج) فرقہ بندی سے اجتناب

(د) شورائیت اور احتساب کی روایات کی تجدید

(ہ) اُمّتِ مسلمہ اور عالمِ انسانیت کے درمیان تعلق کی نشان دہی

ماضی کی اِسلامی تحریکات

جماعت اسلامی کا تاسیسی اجتماع لاہور میں ۱۹۴۱ میں منعقد ہوا۔ اُس وقت تک مُلک تقسیم نہیں ہوا تھا۔ جماعت کے اس تاسیسی اجتماع میں جو پچھتر (۷۵) افراد شریک ہوئے، وہ پورے مُلک سے آئے تھے۔ جماعت کا جو دستور انھوں نے بنایا وہ ایک عالمی جماعت کا تھا۔ اِس دستور میں جماعت اسلامی کا دائرۂ کار کسی ایک مُلک تک محدود نہیں کیا گیا تھا۔ یوں تو تاسیسی اجتماع کے تمام شرکاء کو جماعت کا بانی کہا جاسکتا ہے، لیکن اُن میں کلیدی شخصیت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ مولانا نہ صرف اِس اجتماع کے داعی تھے، بلکہ جماعت

کی بنیاد جن افکار وخیالات پر رکھی گئی، اُن کو ایک مرتب لٹریچر کی صورت میں پیش کرنے والے مفکر بھی تھے۔

مولانا مودودیؒ کی ایک اہم کتاب 'تجدید واحیائے دین' ہے۔ کتابی شکل میں شائع ہونے سے قبل یہ کتاب ماہ نامہ 'الفرقان' کے 'شاہ ولی اللہ نمبر' (۱۹۳۵ء) میں ایک مضمون کی شکل میں چھپ چکی تھی۔ محترم مصنف نے اِس کتاب میں اُن تحریکات کا اِجمالی تذکرہ کیا، جو خلافتِ راشدہ کے بعد مختلف ادوار میں اٹھیں اور انھوں نے اُمتِ مسلمہ کو دوبارہ اُس کے اصل مقام پر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ تجدیدی تحریکات کا یہ تذکرہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے شروع ہوتا ہے اور شاہ ولی اللہؒ پر ختم ہوتا ہے۔ اِن مجددین محترم کے کارناموں کے تعارف سے قبل مولاناؒ نے خود کارِ تجدید کا تعارف کرایا ہے۔

مولانا مودودیؒ نے یہ بات واضح کی ہے کہ کارِ تجدید کا اصل منشا جاہلیت کے تسلّط کو ختم کرنا ہے۔ یہ وہی کام ہے جو انبیاء علیہم السلام انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے نبی اور مجدد کے کام میں جو مماثلت پائی جاتی ہے، اُس کی واضح نشان دہی کی ہے۔ مولانا نے بتایا ہے کہ مجدد نبی تو نہیں ہوتا اِس لیے کہ نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے، لیکن وہ اپنے مزاج میں مزاجِ نبوت سے بہت قریب ہوتا ہے۔ اِسے اللہ ایسی بصیرت عطا کرتا ہے کہ وہ حالات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اِس وقت جاہلیت کی گرفت کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اِس جائزے کے بعد وہ یہ سوچتا ہے کہ اب کِس جگہ ضرب لگائی جائے کہ جاہلیت کی گرفت ٹوٹے اور دین کے احیاء کے لیے راہ ہموار ہو۔

مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب 'تجدید واحیائے دین' میں جو تاریخی تجزیہ پیش کیا، وہ جماعت اسلامی کے قیام کے لیے پس منظر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا نے جس نئی جماعت کے قیام کی دعوت دی، اس کا کام اس کارِ تجدید کا تسلسل ہے، جو امت کے ماضی کے اندر انجام پاتا رہا ہے۔ جماعت اسلامی کے وابستگان کو ماضی کے اِن تجربات سے حوصلہ حاصل کرنا ہے، بزرگوں کی قربانیوں کے اعلیٰ نمونوں سے اپنے جذبات کو جلا دینی ہے، اُن کے اچھے اقدامات کی اپنے حالات کے مطابق پیروی کرنی ہے اور اُن کی لغزشوں سے بچنا ہے۔ یہ سارے کام اُس

وقت ہوسکتے ہیں، جب جماعت اسلامی کے کام کوامت کی تاریخ کے اندر جاری تحریکاتِ تجدید کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھا جائے۔

جماعت اسلامی کے دستور میں عقیدۂ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تشریح کے ذیل میں بنیادی اصولوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اِن اصولوں میں ایک اہم اصول 'معیارِ حق' کی اِصطلاح کے متعلق ہے۔ جماعت کے فہم کے مطابق صحیح اسلامی رویّہ یہ ہے کہ یہ طے کرنے کے لیے کہ کون سا نقطۂ نظر اور رویّہ برحق ہے اور کون برسرِ حق نہیں ہے، صرف کتاب وسنت کو معیار بنایا جائے۔ اس اصول کے مطابق انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی فرد بھی ایسا نہیں ہے، جس کے کام کو کتاب و سنت کے معیار پر نہ پرکھا جاسکتا ہو۔ اِس اصول کا انطباق جس طرح حال کی شخصیات اور افراد پر ہوگا، اُسی طرح ماضی کی شخصیات پر بھی ہوگا۔ اگر ماضی کی تحریکاتِ تجدید اور مجددین کرام کے کارناموں سے فی الواقع فائدہ اٹھانا ہے تو اس اصول کا استعمال ضروری ہے۔

چنانچہ اس اصول کا استعمال کرتے ہوئے خود مولانا مودودیؒ نے ماضی کی تحریکات کا دیانت دارانہ جائزہ لیا ہے اور جہاں جہاں کم زوریاں اور لغزشیں محسوس ہوئیں، اُن کی صاف صاف نشان دہی کی ہے۔ اِس ضمن میں مولانا مودودیؒ نے ولی اللّٰہی تحریک اور تحریک شہیدین کے سلسلے میں تین باتوں کا تذکرہ کیا ہے، جن کے سلسلے میں ان تحریکات کا مطالعہ کرنے والے ہر طالب علم کو فی الواقع تردد محسوس ہوتا ہے:

(الف) 'مغربی طاقتوں خصوصاً انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجوہ کیا ہیں اور اس طاقت کے پیچھے کون سے سماجی وتاریخی عوامل کارفرما ہیں' اِس امر کی کوئی تحقیق 'تحریک شہیدین' کے قائدین نے نہیں کی۔

(ب) مسلمانوں میں جاری روایتی تصوف کی کم زوریوں سے واقف ہونے کے باوجود اِس تصوف کی رائج اِصطلاحات سے پرہیز نہیں کیا گیا، جب کہ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ جرأت کے ساتھ مروجہ تصوف میں اِصلاح کی جاتی۔

(ج) سرحد کے علاقے میں عملی اقدام کرنے سے قبل اُس علاقے کے عوام کو اِصلاحی انقلاب کے لیے تیار نہیں کیا گیا۔ گویا سماجی تبدیلی سے پہلے، قبل از وقت سیاسی اقدام کردیا گیا۔

تجدید واحیائے دین کی سعی کرنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ماضی کی تجدیدی کوششیں اُن کے لیے نمونہ بھی ہیں، تاکہ اُن سے فائدہ اٹھایا جائے، لیکن جو غلطیاں ماضی کے کاموں میں نظر آئیں اُن سے انھیں بچنا بھی ہے۔

اُمّت سے تعلّق

اُمت کے ماضی سے تعلّق کے علاوہ اُمت کے حال سے تعلق کا اظہار بھی جماعت کے قیام کے دوران پیش کردہ امور سے ہوتا ہے۔ تاسیسی اجتماع میں مولانا مودودیؒ نے یہ پہلو واضح کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اِس نئی جماعت کے قیام کی دعوت دینے سے قبل انھوں نے مُلک میں موجود مسلمانوں کی اہم تنظیموں کو اصل اسلامی نصب العین یاد دِلایا اور اُن سے اپیل کی کہ وہ مسلمانوں کے وقتی مسائل کے حل کے لیے کام کرنے کے بجائے بنیادی اِسلامی نصب العین کے لیے کام کریں۔ اِسی طرح مولانا نے یہ اپیل بھی کی تھی کہ مسلمانوں کو مختلف وقتی مقاصد کی طرف بلانے کے بجائے مسلمانوں کی جماعتوں کو یہ چاہیے کہ وہ 'الھدیٰ' اور دینِ حق کی طرف مسلمانوں کو اور تمام انسانوں کو بلائیں۔ یہ اپیل کام یاب نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کی قابلِ ذکر جماعتوں کے نزدیک مسلمانوں کے مسائل نیز آزادی وطن اور قیام پاکستان کے مقاصد کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ وہ جماعتیں اس کے لیے آمادہ نہ ہوسکیں کہ حالاتِ حاضرہ کے پیدا کردہ وقتی مسائل سے قطع نظر کر کے اصل اِسلامی نصب العین کے لیے بہ راہِ راست کام کریں۔ اِسی طرح یہ جماعتیں اِس بات کے لیے بھی آمادہ نہ ہوسکیں کہ 'الھدیٰ' اور 'دین حق' کی طرف مسلمانوں اور انسانوں کو دعوت دیں، بجائے اِس کے کہ آزادی وطن یا قیامِ پاکستان کو اصل دعوت قرار دیں۔

مسلمانوں کی جماعتوں نے جو رویّہ اختیار کیا، اُس کی بنا پر مولانا مودودیؒ کو یہ قدم اٹھانا پڑا کہ وہ ایک ایسی نئی جماعت کے قیام کی دعوت دیں جو بہ راہِ راست اِسلامی نصب العین کے لیے کام کرے۔ اِس نئی جماعت کی تاسیس کے باوجود امت کے حالات اور مسائل سے جماعت نے ہمیشہ سرگرم دلچسپی لی اور ساتھ ہی یہ کوشش بھی ہر مرحلے میں جاری رکھی کہ مسلمانوں کی اہم جماعتیں اور ادارے اصل اِسلامی نصب العین کو اختیار کرلیں اور اپنی تمام دلچسپیوں کو اِس بنیادی نصب العین کے تابع رکھیں۔ امت کے حالات سے سرگرم تعرّض کا کام مولانا مودودیؒ

نے جماعت کے قیام سے قبل ہی شروع کردیا تھا۔ اِس کی پہلی مثال 'الجہاد فی الاسلام' کی تصنیف ہے۔ اِسلام کے تصور جہاد پر عیسائی، آریہ سماجی اور دوسرے حلقوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے جارہے تھے، مسلمانوں کی طرف سے اُن کا کوئی معقول و مدلّل جواب نہیں دیا جارہا تھا۔ اِسی خاموشی کی بنا پر مسلمانوں میں معذرت خواہانہ ذہنیت، بد دِلی اور Demoralization کی کیفیت پیدا ہورہی تھی۔ مولانا کی کتاب 'الجہاد فی الاسلام' نے جو ۱۹۲۷ میں شائع ہوئی، اِس فضا کو ختم کیا اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کا اعتماد اِسلام پر بحال کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

دوسرا فکری چیلنج جو سامنے تھا وہ اُن موضوعات سے متعلق تھا، جن میں اِسلام اور فکرِ مغربی کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے مختلف، بلکہ متضاد ہے، مثلاً سود، پردہ، ضبطِ ولادت، سیکولرزم اور نیشنلزم۔ مولانا نے اِن سب موضوعات پر لکھا اور فکرِ مغربی پر اتنی معقول و مدلّل تنقید کی کہ اِس فکر کا طلسم ٹوٹ گیا اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بڑی تعداد کا اِسلام پر یقین بحال ہوا۔ مولانا کے اِس کارنامے کا اعتراف اُن دینی حلقوں نے بھی کیا جو جماعت سے کسی نوعیت کا اختلاف رکھتے رہے ہیں۔ بعد میں مولانا کی یہ تحریریں ہندستان سے آگے بڑھ کر عالمِ اسلام کے ہر گوشے میں پہنچیں۔ انگریزی، عربی اور دوسری زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے اور ہندستان کی طرح دوسرے ممالک کے مسلمانوں پر مغربی فکر کے اثرات کا ازالہ کرنے میں اِن تحریروں سے غیر معمولی مدد مِلی۔

مسلمانوں کے سامنے ایک اور چیلنج داخلی تھا۔ ایک طرف مغربی تہذیب اور فکر نے مسلمانوں کے ذہنوں کو منتشر کر رکھا تھا اور اُن کے ایمان کی بنیادوں کو متزلزل کردیا تھا، دوسری طرف خود مسلمانوں کے معاشرے کے داخلی مسائل حل طلب تھے۔ مولانا مودودیؒ نے مسلمانوں کے اہلِ علم وفکر کو توجہ دِلائی کہ مسلمانوں کے معاشرے میں جو اِصلاحات مطلوب ہیں، اُن کو اپنے غور وفکر کا موضوع بنائیں۔ مولانا کی کتاب 'حقوق الزوجین' اِس کوشش کی آئینہ دار ہے۔ اِس کتاب میں جو اِصلاحات تجویز کی گئی ہیں، اَب تک ہمارا مسلمان سماج اُن کی طرف توجّہ نہیں کرسکا ہے۔ اِسی طرح مولانا نے مروجّہ نظامِ تربیت (تصوف) کے متبادل کو موضوعِ گفتگو بنایا۔ مولاناؒ نے اِس موضوع پر صِرف اشارے کیے، لیکن جماعت کے دوسرے وابستگان نے اِس پر مبسوط انداز میں لِکھا۔ اِس سلسلے میں مولانا امین احسن اِصلاحی کی تصنیف

'اِسلامی تزکیہ نفس' مولانا صدر الدین اِصلاحی کی 'اساسِ دین کی تعمیر' اور ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری کی 'مقصدِ زندگی کا اسلامی تصور' کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اُمت کے عام اہلِ علم نے جماعت کے اہل قلم حضرات کی اِن کاوشوں کا عام طور پر کوئی نوٹس نہیں لیا۔ جماعت فکرِ مغربی کو شکست دینے میں تو کام یاب ہوئی، لیکن وہ داخلی محاذ پر اِس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکی کہ مسلمانوں کے رائج عائلی نظام اور نظامِ تربیت میں ضروری اِصلاحات کر سکے۔

آزادی سے قبل امت مسلمہ کی جو سب سے بڑی خدمت مولانا مودودیؒ نے انجام دی وہ یہ تھی کہ اپنی کتابوں 'مسئلہ قومیت' اور 'سیاسی کش مکش' کے ذریعے مسلمانوں کو کانگریس کی تحریک میں ضم ہونے سے بچایا اور اُن کے اجتماعی ذہن کو اِس کے لیے آمادہ کردیا کہ وہ اپنی مستقل ملّی حیثیت پر اِصرار کریں اور اپنی تحریکات کو اِسی انداز میں چلائیں۔

امت کے مسائل اور حالات سے ایجابی تعلق اور اِصلاحِ حال کی تدابیر اختیار کرنے کا یہ رویّہ، جو جماعت نے تقسیم ہند سے قبل اختیار کیا تھا، وہ تقسیم کے بعد بھی جاری رہا۔ جماعت اسلامی ہند نے اس سلسلے میں متعدد کام کیے۔ مثلاً فساد زدہ مسلمانوں کے حوصلے کی بحالی اور اُن کی رہ نمائی، دینی تعلیم کا نظم، دینی تعلیمی کونسل کا قیام، فساد زدگان میں ریلیف ورک، پرسنل لا کے تحفظ کے لیے بورڈ کے قیام میں سرگرم شرکت اور مسلمانوں کی تنظیموں کے مشترک پلیٹ فارمس کا قیام۔ اِسی طرح جماعتِ اسلامی پاکستان نے 'نظامِ اسلامی' کے قیام کا مطالبہ کیا، علماء کی مدد سے مشترک نکات منظور کرائے اور پھر اِسلامی دستور منظور کرانے کے لیے کوشش کی، پاکستان میں ابھرنے والی علاقائی تحریکوں کا مقابلہ کیا، قادیانیت کی روک تھام کے لیے عوام وخواص اور حکومت کو توجہ دِلائی اور موثر اقدامات کیے، اِسی طرح فتنۂ انکارِ حدیث کا بھی مقابلہ کیا۔

مندرجہ بالا روایت کو باقی رکھتے ہوئے جماعت کے وابستگان کو اِس کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ امت کے مسائل، مسلمانوں کے حالات اور ان کے اداروں سے جماعت کا گہرا تعلق قائم ہو اور قائم رہے۔ جماعت کا رول یہ ہونا چاہیے کہ وہ مسلمان سماج کے اندر پیدا ہونے والے تمام رجحانات سے باخبر رہے، منفی رجحانات کا بروقت تدارک کرے، اچھے رجحانات کو پروان چڑھائے اور اِس سلسلے میں امت کے تمام صالح عناصر کا تعاون حاصل کرے۔

فرقہ بندی سے اجتناب

جماعت اِسلامی کے تاسیسی اجتماع کے موقعے پر ہی مولانا مودودیؒ نے شرکاءِ اجتماع کو باخبر کر دیا تھا کہ اِس جماعت کو فرقہ نہیں بننا ہے۔

''فرقے کیسے بنتے ہیں؟'' اِس سوال پر بھی مولانا مودودیؒ نے روشنی ڈالی۔ مولانا نے بتایا کہ فرقہ بننے کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ امت کا کوئی گروہ اپنی دعوت میں کسی ایسے جز کا اضافہ کر دیتا ہے جو اصل اسلامی دعوت میں موجود نہیں ہوتا، یا اِسلامی دعوت کے کسی جز کو حذف کر دیتا ہے۔ کچھ گروہ ایسا کرتے ہیں کہ وہ اجزاءِ دعوت میں تو کوئی کمی بیشی نہیں کرتے، لیکن دین میں اُن کی اہمیت کو گھٹا بڑھا دیتے ہیں۔ مولانا نے تنبیہ کی کہ جماعت اِس سلسلے میں محتاط رہے۔ وہ دعوتِ اسلامی کے مختلف پہلوؤں میں اہمیت کی جو ترتیب پائی جاتی ہے، اُس کو علیٰ حالہ برقرار رکھے۔ اگر یہ احتیاط ملحوظ رکھی جائے تو فرقہ بن جانے کا خطرہ ختم ہو جاتا ہے۔

مولانا نے فرقہ بننے کی ایک دوسری وجہ بھی بتائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ نبی کے بعد کسی شخصیت کو یہ مقام دے دیا جائے کہ اُس پر کسی حیثیت سے ایمان لانا ضروری ہو۔ ماضی میں یہ غلطی بعض گروہوں نے کی ہے کہ اپنے رہ نماؤں کو 'مہدی' قرار دے کر اسی حیثیت میں اُن کی شخصیت کی طرف مسلمانوں کو دعوت دی۔ اگر اِس نوع کی کوئی غلطی کی جائے تو وہ گروہ فرقہ بن جاتا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی ہدایت کے مطابق جماعت نے اِس غلطی سے بچنے کا پورا اہتمام کیا ہے۔ دستور میں وضاحت کی گئی ہے کہ جماعت کی دعوت اپنے امیر کی شخصیت کی طرف نہ ہوگی، بلکہ جماعت کے نصب العین کی طرف ہوگی۔ اِسی طرح امیرِ جماعت یا کسی اور شخصیت کو یہ مقام نہیں دیا جائے گا کہ اُس پر کسی حیثیت یا کسی پہلو سے ایمان لایا جائے۔ وابستگانِ جماعت سے جماعت کا مطالبہ جو کچھ ہوگا وہ صرف امیر کی اطاعت فی المعروف کا ہوگا۔

امت مسلمہ کے اہل علم میں تین موضوعات پر شروع ہی سے اختلافات رہے ہیں:

(الف) اِسلامی قانون کی تفصیلات۔ اِس موضوع کو اِصطلاحاً 'فقہ' کہا جاتا ہے۔

(ب) نظامِ تزکیہ و تربیت کی تفصیلات۔ اِس موضوع کو ہماری روایت میں تصوف کہا جاتا ہے۔

(ج) اِسلامی عقائد و تصورات کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے طریقِ استدلال کی تفصیلات۔ یہ موضوع 'کلام' کہلاتا ہے۔

مولانا مودودیؒ نے تاسیسی اجتماع میں یہ بات واضح کی کہ جماعت بہ حیثیت جماعت فقہی اور کلامی مسائل میں ایسا کوئی موقف اختیار نہیں کرے گی جس کی پابندی تمام ارکانِ جماعت کے لیے لازم ہو۔ بہ الفاظِ دیگر اِن موضوعات کے سلسلے میں ارکانِ جماعت کو اجازت ہوگی کہ وہ کتاب وسنت کی روشنی میں خود غور وفکر کریں، یا امت کے اندر موجود معروف مکاتبِ فکر میں سے کسی مکتبِ فکر سے وابستگی اختیار کریں۔ مولانا مودودیؒ خود فقہی اور کلامی مسائل پر لکھتے رہے اور آپ نے یہ کہا کہ گفتگو کی یہ آزادی سب ارکان کو حاصل ہے اور رہنی چاہیے۔ ارکانِ جماعت اِن موضوعات کے سلسلے میں مولانا مودودیؒ کے موقف یا نقطۂ نظر کے پابند نہیں ہیں۔

جماعت نے مسلمانوں سے صاف طور پر یہ بات کہی کہ اقامتِ دین کے مقصد کے لیے سارے مسلمان متفق ہو کر کوشش کریں اور جن اختلافات کی دین میں گنجایش موجود ہے، اُن کو گوارا کریں۔ یہی صحیح دینی مزاج ہے اور جماعت کا یہ مزاج برقرار رہنا چاہیے۔

شورائیت اور احتساب

دورِ اوّل کے بعد مسلمان سماج میں جن پہلوؤں سے زوال آیا، اِن میں نمایاں ترین 'شورائیت' اور 'احتساب' کے پہلو ہیں، جو دورِ اوّل کے معاشرے کے امتیازی اوصاف ہوا کرتے تھے۔

مسلمان معاشرے کے لیے 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ' قرآن مجید کی واضح اور دائمی ہدایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات ہمیں روایات سے معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ کثرت سے مشورے کا اہتمام کرتے تھے۔ آپؐ کا یہ اُسوہ ہر دور میں امت کے لیے اور امت کے ہر گروہ کے لیے واجب الاتباع ہے۔ خلافتِ راشدہ میں ہمیں اِسی اُسوۂ نبوی کے مطابق شورائیت کا اہتمام نظر آتا ہے۔ حکومت وریاست کے معاملات کے علاوہ شورائیت کا اصول زندگی کے دوسرے میدانوں سے بھی متعلق ہے۔ مثلاً خاندانی نظام کے اندر بھی شورائیت

کے تقاضے پورے کیے جانے چاہئیں۔ دورِ اوّل کے معاشرے میں ہمیں زندگی کے تمام پہلوؤں میں شورائیت کی اسپرٹ کارفرما نظر آتی ہے۔

دورِ اوّل کے بعد جب مسلمانوں میں ملوکیت کا دور آیا تو حکم راں مطلق العنان ہو گئے اور شورائیت کا اصول فراموش کر دیا گیا۔ مولانا مودودیؒ نے اِس تبدیلی پر 'خلافت و ملوکیت' میں وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اِس تبدیلی کا اثر پورے معاشرے پر پڑا اور اِصلاحی و تربیتی اِدارے بھی اِس فضا سے متاثر ہوئے۔ جو اِصلاحی کام حکومت کے اثرات سے آزاد تھے، اُن میں بھی اجتماعی کوششوں اور شورائی نظم کی بجائے ہمیں عموماً انفرادی کوششیں نظر آتی ہیں۔ سرگرم افراد کے دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ عموماً یہ تعمیری کوششیں بھی ختم ہو جایا کرتی تھیں۔ اس تاریخی پس منظر کی موجودگی میں جماعت اسلامی نے شورائیت کے اصول کو عملاً زندہ کیا۔ اُس نے اپنے نظم اور تحریک کے ڈھانچے کو شورائی بنیادوں پر مرتب کیا اور عملاً پالیسی سازی اور منصوبوں پر عمل درآمد میں شورائیت کے اصولوں کو برت کر دکھایا۔ جماعت کے اِس رویّے کا مثبت اثر امت کے عام اداروں اور تنظیموں پر بھی پڑنا چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

تنقید و احتساب ایک باشعور مسلمان معاشرے کی پہچان ہے۔ دورِ اوّل میں افراد کے اندر نہی عن المنکر کی اسپرٹ زندہ تھی اور حکم راں اس جذبے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ملوکیت کے دور میں تنقید اور احتساب کی فضا مضمحل ہو گئی۔ حکم رانوں نے بسا اوقات اُن افراد پر سخت مظالم ڈھائے جنھوں نے اُن کو غلط باتوں پر ٹوکنے کی جرأت کی تھی۔ زوال کی اِس فضا نے خانقاہوں کو بھی متاثر کیا، چنانچہ مرشد اور شیخ کی شخصیت کو عملاً تنقید سے بالاتر قرار دیا گیا۔ مرید اور عقیدت مند عموماً اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے مرشد کے افعال و اقوال پر تنقیدی نگاہ ڈالیں۔

جماعت نے تنقید و احتساب کے اِسلامی اصول کو بھی زندہ کیا اور صحت مند روایات کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ جماعت کے اندر تنقید و احتساب کے عمل کو فی الواقع زندہ رکھنے اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے تین امور کی ضرورت ہے:

(الف) جماعت میں ایسی فضا بنائی جائے جس میں تنقید و احتساب کی آزادی ہو اور اُس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہو۔

(ب) تنقید و احتساب کے آداب سے لوگ واقف ہوں اور اُن کا لحاظ کریں۔

(ج) تنقید و احتساب کے لیے ہر سطح پر باقاعدہ مواقع فراہم کیے جائیں اور تمام ارکان کو متعین وقفوں کے بعد یہ ملتے رہیں۔

عالمِ انسانیت سے تعلق

جماعت نے اپنی تاسیس کے وقت سے ہی مسلمانوں کے علاوہ عام اِنسانوں کو بھی مخاطب بنایا۔ یوں تو دعوت الی اللہ مسلمانوں کی ذمّے داری ہے اور تاریخ کے ہر دور میں مسلمان کچھ نہ کچھ اس کی طرف توجہ کرتے رہے ہیں۔ (اِس طرح کی کوششوں کے تسلسل کا ایمان افروز تذکرہ مولانا مودودیؒ نے 'اسلام کا سرچشمہ قوّت' میں کیا ہے۔) لیکن عموماً مسلمانوں کی جماعتوں نے اِس فریضے کی جانب توجّہ نہیں دی تھی۔ جماعت اسلامی نے دعوت الی اللہ کی اِس روایت کو زندہ کیا۔ جماعت کے بنیادی لٹریچر میں کئی کتابیں ایسی ہیں، جن میں مسلمانوں کے علاوہ عام انسانیت کو خطاب کیا گیا مثلاً سلامتی کا راستہ، بناؤ بگاڑ، زندگی بعد موت توحید و رسالت کا عقلی ثبوت، اسلام اور جاہلیت وغیرہ۔ جماعت اسلامی ہند نے اس فہرست میں نئی دعوتی کتب کا اضافہ کیا۔ اب جماعت کی یاددہانی کے نتیجے میں ہندستان کے دوسرے دینی حلقے بھی فریضۂ دعوت کی جانب متوجہ ہونے لگے ہیں۔

جماعت کے آفاقی مزاج کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ ارضی وسماوی آفات کے مواقع پر جماعت نے جو خِدمات انجام دیں، اُن میں صرف مسلمانوں کی نہیں، بلکہ تمام مستحقین کی مدد کی۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی، بلکہ اِسلام کے مزاج کا عین تقاضا تھا۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ مزاج ایک اجنبی مزاج بن چکا ہے۔ اِس لیے اِسلامی مزاج کی تجدید کی بڑی معنویت ہے۔

جماعت کی قیادت کے ۔لیے مناسب ہے کہ جماعت کی امتیازی خصوصیات اپنے وابستگان کو یاد دِلائے اور اِن خصوصیات کو زندہ رکھنے کا عملاً اہتمام بھی کرے۔ اس طرح وہ امت کے مجموعی مزاج میں مثبت اور صحت مند تبدیلیاں لاسکے گی اور عالمِ انسانیت پر بھی اچھے اثرات ڈالے گی۔

مسلم معاشرے میں تحریکِ اسلامی کی ترجیحات

'مسلم معاشرے میں اسلامی تحریک کی ترجیحات کیا ہوں؟' یہ ایک اہم فکری اور عملی موضوع ہے۔ اس سلسلے میں غور کرتے وقت پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مسلم معاشرہ کیا ہے؟ اور اس کے بعد یہ کہ 'تحریکِ اسلامی' سے کیا مراد ہے؟ پھر تیسرا سوال یہ ہے کہ ترجیحات کیا ہوتی ہیں؟ جہاں تک مسلم معاشرے کا تعلق ہے، وہ پوری دنیا میں موجود ہے۔ وہ ایک عالمی امت سے عبارت ہے۔ اس امت کی بنیاد کسی رنگ، نسل، زبان یا علاقے پر نہیں، بلکہ عقیدے پر ہے۔ یہ عقیدہ 'لا الٰہ اللہ محمد رسول اللہ' کا عقیدہ ہے۔ یہ امت آفاقی اور عالمی امت ہے۔ یہ بات بھی سامنے رہنی چاہیے کہ باوجود مختلف ملکوں میں تقسیم ہونے کے امت کا ایک حصہ دوسرے کو متاثر کرتا ہے۔ ایک ملک کے مسلمان جو کچھ سوچتے اور کرتے ہیں، دوسرے ممالک کے مسلمان اس کا اثر قبول کرتے ہیں۔ جب کسی ملک کے اہلِ دانش مسلم معاشرے پر گفتگو کریں گے تو عملاً جو تقاضے سامنے آئیں گے وہ تو اس ملک سے ہی متعلق ہوں گے، لیکن بہ ہر حال اصولی تجزیہ اور گفتگو پورے مسلم معاشرے کو سامنے رکھ کر کرنی چاہیے۔

یہ امت ان معنوں میں بھی آفاقی ہے کہ یہ زمانے کے دائرے میں محدود نہیں ہے، بلکہ ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک باقی رہے گی۔ یہ امت کسی اعتبار سے کوئی محدودیت نہیں رکھتی۔ نہ ملکوں کی، نہ نسلوں یا رنگوں کی، نہ زمان و مکان کی، بلکہ ہر لحاظ سے آفاقی امت ہے۔

امتِ مسلمہ کے اس تعارف کے بعد جو دوسرا سوال قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ تحریکِ اسلامی کیا ہے؟ یہ تحریک اللہ کے فضل سے دنیا کے بیش تر گوشوں میں اور ممالک میں موجود ہے اور اپنے خاص طرزِ فکر سے پہچانی جاتی ہے۔ اگرچہ مختلف تنظیمیں ہیں، جو دنیا میں سرگرم ہیں۔ لیکن یہ پہچاننا مشکل نہیں ہے کہ ان میں تحریکِ اسلامی کسے کہا جائے؟ اگر یہ پوچھا جائے کہ اسلامی تحریک کیا ہے؟ تو مختصر جواب یہ ہوگا کہ اسلامی تحریک وہ ہے جو امت کو اس کے اصل مقام پر فائز کرنے کی کوشش کرے۔ یہ امت کے اندر کی جانے والی ایک کوشش ہے۔ اس کوشش کا امتیاز شعوری ایمان ہے۔ امت اپنے آپ کو بھول چکی ہو، اس پر خود فراموشی طاری ہو تو جو لوگ اس کو اس کا مقام یاد دلائیں اور اس یاد دلانے کے تقاضے بھی پورے کریں، وہ تحریک اسلامی ہیں۔ ان لوگوں کا تعارف قرآن میں ان الفاظ میں کرایا گیا ہے: يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ۔ یعنی وہ خیر کی طرف بلاتے ہیں۔ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (یعنی وہ معروف کا حکم دیتے ہیں) وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (یعنی وہ منکر سے روکتے ہیں)۔

ترجیحات کا مفہوم

ترجیحات کا سوال زندگی کے ہر معاملے میں انسان کے سامنے آتا ہے۔ خود اس لفظ پر غور کریں تو یہ سوال بھی زیرِ غور آ سکتا ہے کہ انسان غلط اور صحیح میں کسے ترجیح دے؟ باطل اور حق میں کسے ترجیح دے؟ دنیا اور آخرت میں کسی ترجیح دے؟ مگر اہلِ ایمان کے سیاق میں اس موضوع میں یہ بات مراد نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ تو بہ ہر حال انھوں نے طے کر لیا ہے کہ ایمان کے تقاضوں کے عین مطابق انھیں حق اور باطل میں سے حق کا انتخاب کرنا ہے اور دنیا و آخرت میں اگر ٹکراؤ ہو تو آخرت کو ترجیح دینی ہے۔ چناں چہ اس موضوع میں ترجیحات سے یہ مراد نہیں ہے کہ غلط اور صحیح میں امتیاز کرنا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ جب خیر کے بہت سے کام مخلص اہلِ ایمان کے سامنے ہوں، مگر وقت محدود ہو، توانائی محدود ہو، وسائل بھی محدود ہوں تو خیر کے کاموں میں سے کن کاموں کو کن دوسرے کاموں پر ترجیح دی جائے؟ یہ ایک عملی سوال ہے۔ یہ سوال اسلامی

سرگرمیوں کے پورے لائحہ عمل کے بارے میں بھی ہوسکتا ہے۔لیکن اس موضوع میں اسے اُن سرگرمیوں تک محدود کیا گیا ہے جو مسلم معاشرے میں انجام دی جائیں۔جب مختلف کام انسان کو اپنی طرف کھینچیں اور ان کے تقاضے اسے اپنی طرف بلائیں اور ان میں سے کسی کی اہمیت سے انکار ممکن نہ ہو، تو اُسے بہ ہر حال یہ طے کرنا ہوگا کہ کس کو زیادہ اہمیت دے اور کس پر زیادہ توجہ دے؟ یہی ترجیحات کا تعین ہے۔

ترجیحات کا تعیّن

بعض ترجیحات دائمی ہیں۔تحریکِ اسلامی کا دائمی کام یہ ہے، چاہے جیسے بھی حالات ہوں، کہ وہ امت مسلمہ کو اس کی اصل حیثیت یاد دلاتی رہے، اس کو معروف کی تلقین کرے، اس کو منکر سے روکے اور اس کو خیر کے کاموں کی طرف بلائے۔ یہ وہ کام ہے جس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس دائمی کام کے بھی بعض تقاضے وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق حالات سے ہوتا ہے، لیکن بہ ہر حال اپنی نوعیت کے لحاظ سے، یہ کام ایک دائمی کام ہے اور ہر قسم کے حالات میں کرنا ہے۔

لیکن بعض ترجیحات وہ ہیں جن کا تعلق حالات سے ہوتا ہے۔اُن کے تعین کے لیے دیکھنا ہوتا ہے کہ امتِ مسلمہ کس حال میں ہے؟ کن مشکلات سے اور کن مسائل سے دوچار ہے؟ جب حالات کے فوری تقاضے سامنے آتے ہیں تو ایک زندہ ملت اور ایک زندہ تحریک کو انہیں ترجیح دینی ہوتی ہے۔مثال کے طور پر خدانہ خواستہ اگر کوئی ارضی وسماوی آفت آجائے تو سب سے اہم کام یہ ہوگا کہ مصیبت زدہ افراد کی مدد کی جائے، باقی کاموں کو وقتی طور پر مؤخر کیا جائے گا۔ ملت کے تحفظ کا مسئلہ دائمی مسئلہ ہے، لیکن اگر اس کا کوئی وقتی پہلو ابھر کر سامنے آجائے تو پھر اس کو اہمیت دی جائے گی اور اس پر زیادہ توجہ صَرف ہوگی۔تو جہاں تک وقتی ترجیحات کا تعلق ہے وہ حالات کے لحاظ سے متعین ہوتی ہیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک اصولی اصطلاح ہے۔ یہ ایک وسیع کام ہے۔ اس کے متنوع تقاضوں میں سے بہت سے تقاضے حالات کے لحاظ سے متعین ہوتے ہیں۔ مثلاً امت مسلمہ جب کسی نئی برائی کی زد میں آرہی ہوتو اس سے روکنے اور بچانے کا کام زیادہ ترجیح رکھتا ہے۔ اسی طرح جب لوگ معروفات پر عمل کررہے ہوں اور کسی خاص معروف کو بھول جائیں تو اسے یاددلانا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ امتِ مسلمہ کو فرض منصبی ادا کرنے کے راستے بتائے جائیں، اسے بتایا جائے کہ معروفات پر عمل کیسے کرے اور منکرات سے چھٹکارا کیسے پائے۔ یہ کام اجتہاد بھی چاہتا ہے اور عملی کوشش بھی۔ مثال کے طور پر سود حرام ہے اور اس سے بچنا لازم ہے، لیکن کیسے بچیں؟ اس کے لیے بہت کچھ کرنے، سوچنے اور راہیں نکالنے کی ضرورت ہے۔

عموماً سوچنے کا جو انداز رائج ہے وہ یہ ہے کہ لوگ علماءِ کرام اور مفتی حضرات سے جائز اور ناجائز کے بارے میں پوچھتے ہیں، یعنی فلاں کام جائز ہے یا ناجائز؟ یہ پوچھنا بہت اچھی بات ہے اور اسلامی شعور کی علامت ہے، لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس سوال میں جو مفروضہ پوشیدہ ہے وہ یہ کہ کاموں کے کرنے کے جو طریقے دنیا میں موجود اور رائج ہیں، انھی میں سے انتخاب کرنا ہے کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز؟ لیکن اہم تر سوال، جو امت کے سامنے ہونا چاہیے، وہ نئے طریقے دریافت کرنے کا ہے۔ اسلام ہم سے جو مطالبہ کرتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ نئے طریقے تخلیق کیے جائیں۔ 'رسائل مسائل' میں مولانا مودودی نے بہت سے سوالات کے جواب میں یہ انداز اختیار کیا ہے کہ سائل نے پوچھا تو جائز ناجائز کے سلسلے میں ہے، لیکن مولانا نے کچھ نئے راستے بتائے ہیں کہ آپ رائج طریقوں کے علاوہ یہ کرسکتے ہیں۔ یہ Creative Action ہے، یعنی اپنی تخلیقی صلاحیت کو استعمال میں لاتے ہوئے حالات کو بدلنے کے لیے نئے متبادل دریافت کرنا اور نئے راستے تلاش کرنا۔ یہ کام معروفات پر عمل اور منکرات سے بچنے کو عملاً ممکن بناتا ہے۔ نئی راہیں تلاش کرنے کا یہ کام کتاب وسنت اور حدود اللہ کے دائرے میں ہوگا، لیکن یہ کام بہ ہر حال ناگزیر ہے۔

جو لوگ تجزیہ کرتے ہیں وہ عموماً یہ کہتے ہیں کہ امت کی سب سے بڑی کم زوری ایمان کی کم زوری ہے۔ یہ بات صحیح ہے، لیکن یہ تجزیہ ناکافی ہے۔ امت میں جن لوگوں کے ایمان کے بارے میں گمان ہوتا ہے کہ وہ کم زور نہیں ہے، ان کی زندگی بھی اسلام کی مکمل عکاسی نہیں کرتی۔ چنانچہ محض ایمان کی کم زوری کو زوالِ امت کا سبب نہیں ٹھہرایا جاسکتا، بلکہ یہ سبب بھی ہے کہ راہیں ہمارے سامنے واضح نہیں ہیں۔ ایمان تو موجود ہے اور اُس میں زندگی بھی ہے، لیکن ایمان کے تقاضے ان حالات میں پورے کیسے کیے جائیں؟ اس سوال کا جواب بسا اوقات اُمت کے اہلِ فکر نہیں دے پاتے۔ مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں اور دوسری اسلامی تحریکوں کے لٹریچر میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کے موجودہ حالات میں امت اور تحریکِ اسلامی دینی تقاضوں کو کیسے پورا کرے؟ اس کی راہیں بتائی اور سجھائی جائیں، لیکن بہ ہر حال یہ کام ایسا ہے جو ہر وقت مزید غور و فکر اور نئے راستے نکالنے کا تقاضا کرتا ہے۔

امتِ مسلمہ اور عصرِ حاضر

اسلامی سرگرمیوں کی ترجیحات طے کرنے کے لیے حالات کا تجزیہ ضروری ہے۔ 'حالات کیا ہیں؟' اس سوال کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ امت مسلمہ کو پوری دنیا کی سطح پر کیا مسئلہ درپیش ہے؟ کیا مشکل اس کے سامنے ہے؟ مندرجہ بالا سوال کے اِس جواب سے شاید اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ اس امت کی مشکل یا مسئلہ یہ ہے کہ کروڑوں کی آبادی میں ہونے کے باوجود یہ ایک اجنبی دنیا میں رہتی ہے۔ یہ دنیا ہمارے لیے اجنبی کیسے بن گئی ہے؟ اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

ہمارا ایمان تو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ہے، ہم ایک اللہ کو معبود مانتے ہیں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے، لیکن جب ہم دنیا میں باہر نکلتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہماری تعلیم گاہوں میں، سیاست کے ایوانوں میں اور سماج کے اداروں میں جو لوگ انسانوں کی قیادت کر رہے ہیں، وہ چاہے خدا کو مانتے ہوں، لیکن خدا کی ہدایت کو نہیں مانتے۔ خدا کی ہدایت سے غافل اور باغی یہ دنیا ہم سے کہیں دور اور الگ نہیں ہے، بلکہ ہمارے قریب ہی موجود ہے۔ جیسے ہی ہم گھر سے اور

مسجد سے باہر نکلتے ہیں، اِس دنیا سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔ اس دنیا میں ہمیں رہنا بھی ہے اور کام بھی کرنا ہے، مگر ہمارے لیے یہ ایک اجنبی دنیا ہے۔ اس کا تصورِ حیات ہم سے جدا اور خدا کے انکار پر مبنی ہے۔ اس دنیا کی روایات اور اس کے چلن ہمارے لیے اجنبی ہیں۔ اس کے کام کرنے کے انداز اسلامی مزاج کے مغائر ہیں۔ اس کی اصطلاحات ہماری نہیں ہیں۔ اس کے الفاظ، جملے اور نعرے ہمارے نہیں ہیں۔ درد تو انسانیت کا یہ دنیا بھی محسوس کرتی ہے اور ہم بھی، لیکن جب اس کو بیان کرتے ہیں تو اندازِ بیان الگ الگ ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک بعض مسائل اہمیت رکھتے ہیں اور دنیا کے نزدیک دوسرے مسائل اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں سے یہ دنیا ہمارے لیے اجنبی ہے۔ جن لوگوں کے قبضے میں سماجی ادارے ہیں، تعلیم گاہیں ہیں، اقتدار ہے اور ذرائع ابلاغ ہیں، ان کا تصورِ کائنات، اقدار اور کلچر امتِ مسلمہ سے مختلف ہے۔

ان حالات میں امتِ مسلمہ کے سامنے ایک بنیادی سوال آتا ہے۔ اس سوال پر تحریکِ اسلامی کی رہ نمائی مطلوب ہے۔ سوال یہ ہے کہ 'اس ماحول کے ساتھ، جو ہمارے قریب میں موجود ہے، ہم کیا سلوک کریں؟'

قطعِ تعلق کا مشورہ، جو تحریک نے دیا تھا، وہ نظامِ باطل کے بارے میں تھا۔ نظام کا جو مطلب بھی متعین کیا جائے، لیکن بہ ہر حال وہ مشورہ سماج کے سلسلے میں نہیں تھا اور پورے ماحول کے بارے میں نہیں تھا۔ یہ ممکن بھی نہیں ہے کہ اس دنیا سے قطعِ تعلق کرلیا جائے۔ دوسرا ممکن رویہ، جو مسلمانوں کا عام رویہ ہے، وہ اس دنیا کی رَو میں بہہ جانے کا ہے۔ عموماً مسلمانوں نے یہ رویہ اپنا رکھا ہے، مگر جھجک کے ساتھ، اس لیے کہ ایمان بہ ہر حال قدم قدم پر روکتا ہے چنانچہ مسلمان ٹھٹکے ہوئے قدموں کے ساتھ دنیا کے پیچھے چلتے ہیں۔ آج کل مسلم پس ماندگی (Backwardness) کا بہت تذکرہ ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں جھجکتے ہوئے چل رہے ہیں۔ ہمارے مزاج کے لیے یہ اجنبی دنیا ہے تو پیچھے رہ جانا فطری ہے۔ یہ وہ رویہ ہے جو عام طور پر امت نے اپنا لیا ہے۔ اس لیے کہ قطعِ تعلق ممکن نہیں ہے۔

مگر جو رویہ اسلام کے شایانِ شان ہے، اسلامی تحریک کے شایانِ شان ہے اور امتِ مسلمہ کے شایانِ شان ہے، وہ یہ ہے کہ آپ اس دنیا کو بدلیں۔ جب یہ آپ کے اصولوں

کے مطابق نہیں ہے تو آپ اس کے مطابق نہ بن جائیں، بلکہ اس کو حق کے مطابق بنانے کی کوشش کریں۔ یہ وہ بات ہے جو اسلامی تحریک سامنے رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک الجھن سامنے آتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ آپ نے دنیا کو بدلنے کی بات کہنا شروع کی اور دیکھا کہ لوگ نہیں سنتے تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ ہم کچھ نہ کر سکے۔ ہمارا سماج میں نفوذ نہیں ہوا۔ ہم لوگوں کو ساتھ نہیں لے سکے۔ یہ ہماری ناکامی ہے۔ چنانچہ خیال آتا ہے کہ ہمیں اپنے رویے کو بدلنا چاہیے۔ کچھ اصولوں میں سمجھوتہ کرنا چاہیے، کچھ لچک پیدا کرنی چاہیے، کچھ باتیں ایسی کہنی چاہئیں جو لوگوں کو پسند ہوں، جن سے لوگ ہماری طرف آجائیں۔ جب ہم یہاں تک پہنچ جاتے ہیں تو انحراف کا آغاز ہوتا ہے۔

اصولوں کی پابندی

اِس انحراف سے بچنے کے لیے یہ اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہماری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ بہ ہر حال لوگوں کو ساتھ لیں۔ ہماری ذمہ داری اصلاً یہ ہے کہ ہم حق بات کہیں۔ جو حق کو پسند کرتا ہے وہ ہمارے ساتھ آئے۔ جو اسے پسند نہیں کر سکا وہ ہمارے ساتھ نہ آئے۔ یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ہم پر نہیں ڈالی ہے کہ ہم ہر شرط پر لوگوں کو ساتھ لیں۔ یہ ذمہ داری بھی نہیں ڈالی کہ ہر قیمت پر سماج میں نفوذ کریں۔ یہ ذمہ داری بھی نہیں ڈالی کہ تمام حدود کو توڑ کر ہر ادارے میں اپنے اثرات بڑھائیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داریاں ہم پہ نہیں ڈالی ہیں۔ اس نے تو یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ ہم حق بات کہیں۔ جب وہ بات قبولیت حاصل کر لے گی تو پھر اس کے لحاظ سے فطری طور پر نفوذ ہوگا۔ ایک فرد حق کو مان لیتا ہے تو وہ بدلے گا۔ ایک خاندان مان لیتا ہے تو خاندان بدلے گا، ایک ادارہ اس سے متاثر ہوتا ہے تو ادارہ بدل جائے گا۔ پورے ملک کا نظامِ اقتدار متاثر ہوتا ہے تو وہ بدل جائے گا۔ لیکن اپنے اصولوں کی قیمت پر شرکت، اپنے اقدار کی قیمت پر شرکت، اپنی روایات، اپنے طرزِ فکر کی قیمت پر شرکت، یہ وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ہم سے مطالبہ نہیں کیا ہے۔

یہ ایک انقلابی رویہ ہے جس کی اسلامی تحریک دعوت دیتی ہے کہ آپ اس دنیا کو بدلیں ؎

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اپنا جہاں پیدا کرنے کی دعوت اسلامی تحریک نے دی ہے، مگر اللہ کی مشیت سے یہ سفر کبھی تیز رفتار بھی ہو سکتا ہے اور جلد ہی منزلیں آنا شروع ہو سکتی ہیں، کبھی یہ سست بھی ہو سکتا ہے، حضرت مسیح کے حواریوں کی پیش رفت کی طرح بڑی دیر لگ سکتی ہے۔ اس دوران محسوس ہو سکتا ہے کہ کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ ایسی کیفیت میں بہ ہر حال راہِ راست پر ثابت قدم رہنا ہے۔

یہ موجودہ حالات کا خلاصہ ہے۔ امتِ مسلمہ اپنے آپ کو ایک اجنبی دنیا میں پاتی ہے۔ اس اجنبی دنیا کو بدلنے کے سلسلے میں اسلامی تحریک کو رہ نمائی کرنی ہے۔ دائمی ترجیحات ہوں یا وقتی ترجیحات، دونوں میں اسلامی تحریک کا رول، کردار اور مقام یہ ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کی رہ نمائی کرے۔ امت کو یہ بتائے کہ وہ کیا موقف اختیار کرے، کیا پالیسی اختیار کرے۔ یہ بات طے کرنے کے لیے تحقیق بھی ضروری ہے اور باہمی مشورہ بھی۔

تعمیر ملت اور ہماری ترجیحات

امت کی صورتِ حال دوسرے بہت سے کاموں کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ یہ تعمیری کام ہیں، جن کے کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کے میدان میں، سماج کے میدان میں اور لوگوں کے مسائل حل کرنے کے میدان میں۔ اس کے علاوہ بہت سے کام وہ ہیں جو ملت کے تحفظ کے سلسلے میں کرنے ہیں۔ اِن میں بعض کام فوری توجہ کے طالب ہیں۔ تعمیر اور تحفظ کے یہ کام سعیِ مسلسل کا تقاضا کرتے ہیں۔

تعمیری کاموں کے ضمن میں بھی ترجیحات کا سوال زیرِ غور آتا ہے۔ تحریک اسلامی کا موقف یہ رہا ہے کہ ہمیں اصل ترجیح بنیادی کام کو دینی چاہیے کہ امت کو اس کا مقام و منصب یاد دلائیں اور اس کی رہ نمائی کریں کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ جہاں تک تعمیری اور سماجی سرگرمیوں اور ان کاموں کا معاملہ ہے، جن کا تعلق ملت کے تحفظ سے ہے، اس میں ملت کی تنظیموں، اداروں اور

عام افراد کو متوجہ اور متحرک کریں اور خود بھی شریک ہوں۔ ہماری توانائی اور ہمارے وسائل کے پیشِ نظر اس تعمیری کام کا مقام بنیادی کام کے بعد ہے۔

اقامتِ دین کے بہت سے پہلو ہیں۔امت کو اس کے اصل مقام پر لانا بھی اقامتِ دین کا حصہ ہے اور امت کے اندر تعمیری کام کرنا بھی اقامتِ دین کا جز ہے۔ جب یہ خیال ہوتا ہے کہ اقامتِ دین کے یہ سارے اجزاء ایسے ہیں جن پر کسی ایک تنظیم کو اپنی تنہا طاقت سے کام کرنا ہے تو پھر سوچنے والے دشواری میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن جب یہ حقیقت سامنے ہوتی ہے کہ یہ کام پوری امت کو انجام دینا ہے اور تحریکِ اسلامی کا کام یہ ہے کہ امت کو متحرک کرے، آمادہ کرے، متوجہ کرے اور اس کو راہیں بتائے تو پھر یہ مشکل آسان ہوجاتی ہے۔ اسلامی تحریک کا موقف یہ ہے کہ اُمت کو اُس کا اصل مقام و منصب یاددلانے اور امت کی اصولی رہ نمائی کرنے کا کام ترجیح کا مستحق ہے۔ تعمیری ایجنڈا امت کے تعاون سے پورا کیا جائے۔ وسائل، اوقات اور اپنی توانائی کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ترجیحات کی یہ ترتیب صحیح ہے۔ اس ترتیب میں تحریک اسلامی کا کام رہ نما اور قائد کا ہے، جسے پوری امت کو متحرک (mobilise) آمادہ اور متوجہ (motivate) کرنا ہے۔

قیادت کا ظہور

تعمیری ایجنڈے پر عمل درآمد کے لیے امت میں لیڈر شپ یا قیادت کا فروغ ضروری ہے۔ مولانا مودودیؒ نے چار نکاتی لائحہ عمل کے علاوہ 'سیاسی کش مکش' میں بھی اس ضرورت کا اظہار کیا ہے۔ دوسری تحریروں میں ان کا تجزیہ یہ ہے کہ اس وقت امت میں جن لوگوں کے اندر قیادت کی صلاحیت ہے، وہ علماء کرام نہیں ہیں، بلکہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مغربی تعلیم حاصل کی ہے، البتہ ان کو اپنی اخلاقی کم زوریوں پر قابو پانا چاہیے۔ یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ انھوں نے کہی ہے۔ اپنی اصلاح کے بعد مغربی تعلیم یافتہ افراد اُمت کی خدمت کرسکتے اور قیادت کی ضرورت پوری کرسکتے ہیں۔ تحریکِ اسلامی کو یہ کوشش کرنی ہے کہ اُمت میں ایک سنجیدہ، دیانت دار اور فعال لیڈر شپ وجود میں آئے اور وہ قیادت امت کے اندر تعمیری کام انجام دے۔ یہ توقع

مولانا مودودیؒ نے مغربی تعلیم یافتہ طبقے سے کی ہے۔ مولانا کے تجزیے سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ علماءِ کرام کو قائدانہ رول ادا کرنا چاہیے اور مغربی تعلیم یافتہ طبقہ اُن کے ساتھ تعاون کرے، لیکن جو بنیادی بات ہے وہ یہ کہ ایسی قیادت موجود ہو جو اپنی کم زوریوں پر بھی قابو پائے اور ایک ایسا لائحۂ عمل اور منصوبہ بھی بنائے جو امت کے اندر تعمیری کام کرسکتا ہو۔

پچھلے دنوں امت میں تعمیری شعور پیدا ہوا ہے اور متعدد تعمیری کام شروع ہوئے ہیں۔ ان میں بہت سی تنظیموں کا حصہ ہے۔ تعمیری کاموں کے سلسلے میں دو الجھنیں پیدا ہوتی ہیں، ان کا ذکر ضروری ہے۔ اگر ہم ان پر قابو نہ پائیں تو تعمیری کام مفید ہونے کے بجائے مضر ہوسکتا ہے۔ ایک مشکل تو یہ ہوتی ہے کہ ان کاموں کا رشتہ امتِ مسلمہ کے مقام و منصب اور مشن سے قائم نہیں رہتا۔ تعمیری کام کرنے والے بسا اوقات اسلامی دعوت، اسلامی اقدار اور اسلامی طرزِ فکر کو اپنے کاموں کی بنیاد نہیں بنا پاتے، بلکہ اُن طریقوں سے کام کرتے ہیں جو دنیا میں رائج ہیں۔ کچھ تو اس لیے کہ جو طریقے رائج ہیں اُن کو اپنانا آسان ہے، سوچنا نہیں پڑتا اور کچھ اس لیے کہ اس طرح لوگوں کا تعاون آسانی سے مل جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ اگر مسلمان سماجی، تعمیری اور تعلیمی کام اُن طریقوں سے انجام دیں گے جن کو لوگ دنیا میں اختیار کیے ہوئے ہیں، جن میں حدود شکنی بھی ہے اور اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی بھی، تو یہ اپنی منزل کی الٹی سمت میں سفر ہوگا۔ اس انحراف کے ساتھ دعوت اسلامی اور اقامتِ دین کی گفتگو بھی کرتے رہنا ایک تضاد ہوگا۔ اس الجھن پر قابو پانا چاہیے۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہم اسلامی آداب کے مطابق تعمیری کام کریں ہم اور حدودِ شریعت سے تجاوز نہ کریں۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ ہم جب تعمیری کام کرتے ہیں تو بہت جلد یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس کام کو بڑے پیمانے پر کرنے کے لیے اور تیز رفتار سے چلنے کے لیے نظامِ وقت کے ساتھ سمجھوتہ ضروری ہے، اس کی قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے۔ اگر آپ کے تیور انقلابی ہوں، جیسا کہ اسلامی تحریک کے لٹریچر میں ہیں اور اگر آپ دنیا کو بدلنے کی باتیں کرتے ہوں تو پھر آپ کے ساتھ تعاون کرنا نظامِ وقت کے ہم نواؤں کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ تعمیری کام ذرا کم، محدود اور سست رفتار ہوجاتا ہے۔ اس الجھن کا حل یہ ہے کہ ہم رفتار کے سست ہونے سے پریشان نہ

ہوں، چھوٹے پیمانے پر کام پر قناعت کریں، لیکن باطل کے عَلَم برداروں سے سازگاری نہ کریں۔ تحریکِ اسلامی جو کچھ کرے اُس میں محض لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اپنے اصولی موقف میں ترمیم نہیں کرسکتی۔

اصولی اعتبار سے تعمیر اور انقلاب میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، لیکن عملاً یہ مشکل پیش آجاتی ہے کہ تعمیر کا تیز رفتار کام انقلابی تیوروں میں تبدیلی چاہتا ہے۔ اگر یہ تبدیلی گوارا کرلی گئی تو یہ اپنی راہ خود کھوٹی کرنے کے مترادف ہوگا، اس لیے اس قیمت کو دیے بغیر جو تعمیری خدمت انجام دے سکتے ہوں وہ انجام دینی چاہیے اور اسے کافی سمجھنا چاہیے۔ ہمیں اس دنیا کو بدلنا ہے، مگر اپنی شرائط کے ساتھ۔ خود نہیں بدل جانا ہے۔ یہ نہیں کرنا ہے کہ کچھ ہم بدل جائیں اور کچھ دنیا بدل جائے، بلکہ دنیا کو بدلنا ہے اور اپنی شرائط پر بدلنا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ رائج نظام نے جو آزادیاں دی ہیں اور جن سے ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں، اُن کی قیمت بھی ادا کرنی چاہیے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمیں قیمت ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا میں ہم جس آزادی سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں وہ کسی نظام کی عنایت نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی آزادیاں ہیں، جو ہر انسان کو فطری طور پر حاصل ہیں۔ اگر کسی نظام نے انسانوں کے فطری حقوق میں سے بعض کو تسلیم کر رکھا ہے تو وہ اُس کی عنایت نہیں ہے اور اگر کسی نے فطری آزادی چھین رکھی ہے تو وہ اس کا ظلم ہے۔

ہمیں شکر ادا کرنا ہے، مگر اللہ کا شکر ادا کرنا ہے، اس کے علاوہ کسی قیمت کے ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلامی تحریک کا پیغام یہ ہے کہ اہلِ ایمان اصولوں پر قائم رہیں اور اس دنیا کو بدلنے کا عزم رکھیں۔ تحریکِ اسلامی کی ترجیح یہ ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کو اس کی اصل حیثیت یاد دلائے۔ اگر اس کام کو کرنے میں تحریک کام یاب ہوجائے تو پھر یقیناً امت اس کی رہ نمائی سے فائدہ حاصل کرے گی اور تاریخ کے اس مرحلے میں، جب کہ وہ ایک اجنبی دنیا کے تسلط میں ہے، آزادی کی طرف اس کے قدم بڑھ سکیں گے۔

عالمِ اسلام کا مستقبل اور تحریکِ اسلامی

عالمِ اسلام کے سیاق میں بیسویں صدی کے دو اہم واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک استعماری طاقتوں سے آزادی ہے۔ پچھلی صدی کے وسط میں مسلمان ممالک مغربی طاقتوں کی غلامی سے آزاد ہوئے۔ آزادی کی تحریک چلانے میں مسلمانوں کے تمام عناصر شریک تھے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہر ملک میں مسلمان علماء اور اُن کے اداروں نے ان تحریکات میں نمایاں رول ادا کیا۔ آزادی کے حصول کے لیے مسلمانوں نے جو جدوجہد کی، اس کا ایک بنیادی محرک یہ توقع تھی کہ آزادی کے بعد وہ اپنے ملک اور سماج کی تعمیرِ نو اسلام کے مطابق کرسکیں گے اور اللہ کی نازل کردہ شریعت اُن کے آزاد ملک کا قانون ہوگی۔ بیسویں صدی کا دوسرا اہم واقعہ یہ تھا کہ عالمِ اسلام میں ایسی تحریکیں اٹھیں جنھوں نے اسلام کے قیام کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ برِصغیر میں جماعتِ اسلامی اور مصر میں اخوان المسلمون کی تحریک کا آغاز ہوا۔ ان تحریکوں نے اپنے کام کو تنظیمی شکل دی، اپنے پیغام کو وسیع پیمانے پر پھیلایا اور اسلام کی ترجمانی و تفہیم کے لیے مدلل لٹریچر شائع کیا۔ بیسویں صدی کے اختتام تک ان تحریکوں کے اثرات ساری دنیا میں پھیل چکے تھے۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کو انھوں نے خاص طور پر متاثر کیا اور اُن کی ایک قابلِ ذکر تعداد کی زندگیوں کا رخ بدل دیا۔

عالمِ اسلام میں پیش آنے والے بیسویں صدی کے اِن دو اہم واقعات کے پس منظر میں اس عوامی تحریک کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے، جس کا ظہور پچھلے چند برسوں میں عالمِ عرب میں ہوا۔ اس عوامی تحریک کو دنیا کے مبصرین نے عام طور پر حیرت اور استعجاب کے ساتھ دیکھا۔ بہت سے

حلقوں میں اس نئے مظہر سے خوش آئند توقعات وابستہ کی گئیں، وہیں جابر حکم رانوں کے درمیان تشویش اور بے چینی محسوس کی گئی۔ اب دنیا کے اور خود عالمِ اسلام کے سامنے اہم سوال یہ ہے کہ 'کیا یہ عوامی تحریک اپنی فطری منزل تک پہنچے گی یا منفی طاقتیں اس تحریک کا زور توڑ دینے میں کام یاب ہوجائیں گی؟' اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے دو اہم امور پر غور کرنا ہوگا۔ ایک قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اس عوامی تحریک کی فطری منزل کیا ہے؟ اور اس تحریک کی کام یابی عالمِ اسلام میں کیا اساسی تبدیلی لائے گی؟ دوسرا اہم سوال اُن عوامل سے متعلق ہے جو حالات پر اثر انداز ہوں گے۔ صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے ان داخلی اور خارجی عوامل کی نشان دہی ضروری ہے، جو عوامی تحریک کو کام یاب یا ناکام بنا سکتے ہیں۔ یوں تو یہ عوامل بہت سے ہیں، لیکن قابلِ ذکر اثر ڈالنے والے عوامل غالباً مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) مسلمان عوام
(ب) نئی نسل کا تعلیم یافتہ عنصر
(ج) مسلمان حکم راں طبقہ
(د) دینی جماعتیں اور علماء
(ہ) مغربی طاقتیں

ان پانچ عوامل کے علاوہ ایک اہم عامل 'اسلامی تحریک' ہے۔ اسلامی تحریک کو اللہ کی تائید کے سہارے ایسی منصوبہ بند جدوجہد کرنی ہوگی کہ اس کا رول حالات کا رُخ متعین کرنے میں فیصلہ کن ثابت ہو، وہ دوسرے مثبت عوامل کو صحت مند تبدیلی کے حق میں استعمال کرسکے اور منفی عوامل کے اثر کو زائل کرسکے۔

عوامی تحریک کی منزل

دنیا کے عوام کے سامنے یہ تخیل پوری قوت کے ساتھ آچکا ہے کہ اُن پر حکومت کرنے والے اُن کی رائے سے منتخب ہونے چاہئیں۔ دنیا میں مقبول اس تخیل کا اثر عرب ممالک کے عوام پر بھی پڑا ہے، چنانچہ جن ممالک میں بادشاہتیں قائم ہیں یا جہاں ڈکٹیٹروں کی حکومت ہے، وہاں کے عوام اُن سے آزادی چاہتے ہیں۔ یہ توقع فطری ہے کہ عالمِ عرب میں جاری عوامی تحریک کا نتیجہ ایسی حکومتوں کا قیام ہوگا جو عوام کی آزاد رائے سے منتخب ہوں گی۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ عالمِ عرب کی عوامی تحریک کا ظہور محض معاصر دنیا کے جمہوری رجحان کا عکاس نہیں ہے، بلکہ اُس کی جڑیں پچھلی صدی کی اس تحریک آزادی سے ملتی ہیں جو استعمار کی غلامی سے نجات کے لیے عالمِ اسلام میں برپا ہوئی تھی اور جس کو عوام اور علماء دونوں کا سرگرم تعاون حاصل تھا۔ دونوں تحریکوں کا یہ تعلق ایک تاریخی حقیقت ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس حقیقت کا ادراک عوامی تحریک کی فطری منزل متعین کر دیتا ہے۔ یہ منزل ہر مسلمان ملک میں ایک ایسی حکومت کا قیام ہے جو اسلام کے مطابق ملک اور سماج کی تعمیرِ نو کا عزم رکھتی ہو اور جس کے چلانے والے عوام کی آزاد مرضی سے منتخب ہوتے ہوں۔

دنیا کے ذرائعِ ابلاغ پر جن عناصر کا قبضہ ہے، انھوں نے یہ تخیل پیش کیا ہے کہ عوامی تحریک کے نتیجے میں ایک سیکولر جمہوری حکومت قائم ہونی چاہیے،لیکن یہ خیال سطحیت پر مبنی ہے۔ یہ اُس تحریک آزادی کو نظر انداز کرتا ہے جس میں غیر معمولی قربانیاں دی گئی تھیں اور جس کا سب سے قوی محرک اسلامی نظامِ زندگی کے احیاء کا وہ جذبہ تھا، جس نے عالمِ اسلام کے عوام کو سرشار کر رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ معاصر عوامی تحریک پچھلی صدی کی تحریک آزادی کا تسلسل ہے چنانچہ اُس کی فطری منزل استعمار کی غلامی سے مکمل نجات اور شریعتِ الٰہی کو نافذ کرنے والی حکومت کا قیام ہے۔

کسی عوامی تحریک کو ناکام بنانے کے لیے دنیا میں عموماً دو طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک طرف ظلم، جبر اور تشدد کے ذریعے تحریک کو روکا جاتا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ مظالم اور شدائد سے گھبرا کر تحریک کے علم بردار اپنے مشن سے باز آجائیں گے۔ اگر تحریک چلانے والے ثابت قدمی کا ثبوت دیں اور قربانیوں کے لیے آمادہ ہوں تو عموماً یہ حربہ تحریک کا راستہ روکنے میں کام یاب نہیں ہوتا، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زیادتیوں اور مظالم سے تحریک کو ایک نئی زندگی ملتی ہے۔؎

بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد

البتہ تحریکوں کا راستہ روکنے کے لیے دنیا میں ایک دوسرا حربہ بھی استعمال ہوتا رہا ہے اور وہ زیادہ کارگر ہے۔ تحریک کے مخالفین یہ کوشش کرتے ہیں کہ تحریک کی منزل کے بارے میں

خود اُس کے علم برداروں کے ذہن میں انتشار اور خلجان (Confusion) پیدا کر دیا جائے۔اگر یہ کوشش کام یاب ہو جائے تو فکری انتشار بہت جلد عملی انتشار کی شکل اختیار کر لیتا ہے، یا تحریک انحراف (Deviation) کی طرف لے جانے لگتی ہے۔ چنانچہ اس وقت دنیا کے ذرائعِ ابلاغ اسی سعی میں لگے ہوئے ہیں کہ عالمِ عرب کی عوامی تحریک کو اُس کی اصل منزل سے منحرف کر دیا جائے۔عالمِ اسلام کے باشعور عناصر کو پوری کوشش کرنی ہوگی کہ مفسدینِ عالم کا یہ منصوبہ کام یاب نہ ہو، عوامی تحریک انحراف کا شکار نہ ہونے پائے، بلکہ اپنی حقیقی منزل کی طرف گامزن رہے۔

عالمِ اسلام کا باشعور عنصر

مسلمانوں کی نفسیات کی تشکیل میں اسلام بنیادی رول ادا کرتا ہے، لیکن دنیا کے مقبول نعرے اور نظریات دوسرے انسانوں کی طرح مسلمانوں کو بھی متاثر کرتے ہیں، چنانچہ عالمِ عرب کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے تحت الشعور پر یقیناً اسلام کی حکم رانی ہے، لیکن اُن کے شعور پر اجنبی تصورات نے بھی اپنے اثرات ڈالے ہیں۔ سیکولرزم، نیشنلزم، علاقائی وقبائلی عصبیت اور عرب قومیت کے منفی اثرات اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے عرب دنیا کے مسلمانوں کے اسلامی شعور کو متاثر کیا ہے۔ان حالات میں مسلمانوں کے اس عنصر کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے جو اِن باطل نظریات اور نعروں کے شر سے واقف ہے اور جسے اسلام کا صحیح فہم بھی حاصل ہے۔اس عنصر کو 'تحریکِ اسلامی' کہا جاتا ہے۔ عالمِ اسلام کو درست رہ نمائی فراہم کرنا اس عنصر کا بنیادی کام ہے۔

کسی انسانی گروہ کی رہ نمائی کرنے کے لیے کچھ صلاحیتیں درکار ہیں۔ حالات کا درست تجزیہ کر کے پیش قدمی کی راہ نکالنے کی صلاحیت اُن میں سے ایک ہے۔ درست تجزیے کے لیے محض حالاتِ زمانہ کے متعلق معلومات کافی نہیں، بلکہ اُس نقطۂ نظر کا گہرا شعور بھی تجزیہ کرنے والوں کو حاصل ہونا چاہیے جس کے وہ علم بردار ہیں۔اسی طرح رہ نمائی کے لیے درکار دوسری بنیادی صفت عزم وحوصلہ اور کردار کی پختگی ہے۔اس وصف کے بغیر کوئی رہ نمائی، انسانوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔ایک تیسری صفت، جس کی ضرورت ہے، وہ وسیع النظری اور

عالی ظرفی ہے۔ جس گروہ کی رہ نمائی پیش نظر ہے، اس کے تمام افراد شعور کی پختگی کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے۔ اُن کی خامیوں اور کم زوریوں کے باوجود صبر، حکمت، ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ اُن کی رہ نمائی کا کام بڑا ظرف چاہتا ہے۔

اُمتِ مسلمہ بھی ایک انسانی گروہ ہے۔ اس کی رہ نمائی کا فریضہ تحریک اسلامی کے سپرد ہے۔ چنانچہ تحریکِ اسلامی کو اپنے اندر بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کی صفات پیدا کرنی ہوں گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر کا مستند فہم، علم برداران تحریک کو حاصل ہو اور وہ حالات کا تجزیہ اس فہم کی روشنی میں کر سکیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج امتِ مسلمہ مختلف عصبیتوں کا شکار ہے، جو قومی و وطنی بھی ہیں، قبائلی اور نسلی بھی اور مسلکی، فرقی و جماعتی بھی۔ ان حالات میں تحریکِ اسلامی کا ایک اہم کام یہ ہے کہ عصبیتوں سے مسلمانوں کو نجات دلائے، جائز اختلافات کو عصبیت بننے سے روکے اور دین کی بنیاد پر مسلمانوں کو یک جہتی، اتحاد، اجتماعیت اور اشتراکِ عمل پر آمادہ کرے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے یہ بہ ہر حال ناگزیر ہے کہ تحریکِ اسلامی خود اپنے بارے میں چوکنّا رہے اور اپنے دامن کو کسی عصبیت سے آلودہ نہ ہونے دے۔ اس کا مقام تقاضا کرتا ہے کہ قرآن وسنت فی الواقع اس کی اساسِ کار ہوں، اُن کے دائرے کے اندر وہ تمام اہلِ ایمان کا یہ حق تسلیم کرے کہ وہ اخلاص کے ساتھ، علم کی روشنی میں قرآن وسنت کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں۔ تحریکِ اسلامی کو ایسے رویے سے اجتناب کرنا چاہیے جو اُسے ایک مسلک یا محدود مکتبِ فکر بنا دے۔ اس کے دامن میں وہی وسعت ہونی چاہیے جو خود اسلام کے آفاقی تصور میں پائی جاتی ہے۔

عالمِ اسلام میں حالات بہ ظاہر ایسے موڑ پر آچکے ہیں کہ مثبت اور منفی دونوں امکانات بروئے کار آسکتے ہیں۔ مثبت امکان یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی شروع ہو جائے اور اس راہ کے مراحل طے ہونے لگیں۔ اس کے برعکس منفی امکان بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ عوامی تحریک کا رخ سیکولر نظام کی طرف موڑ دیا جائے۔ ان حالات میں اسلامی تحریک کا کردار کلیدی ہے۔ اُسے ذہنی، فکری اور عملی تیاری کے ساتھ امت کے تمام عناصر کی رہ نمائی کرنی ہوگی۔ اگر اخلاص کے ساتھ علم بردارانِ تحریک نے یہ کام انجام دیا اور تنگ نظری و

عصبیت سے اپنے کو بچائے رہے تو توقع کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں کو اُن کی طرف راغب کردے گا، اُمت اُن کی رہ نمائی سے مستفید ہوگی، استعمار کی چالیں ناکام ہوں گی اور عالمِ اسلام کی حقیقی آزادی کی راہیں کھلیں گی۔ تب اس کا بھی امکان ہے کہ عالمِ اسلام کی خوش گوار تبدیلیاں دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے لگیں اور نیشنلزم وسیکولرزم کے فتنوں سے نجات کی راہ دنیائے انسانیت کو نظر آجائے۔ تحریکِ اسلامی کو موجودہ حالات احتسابِ زمانہ کے ساتھ خوداحتسابی اور تجدیدِ عہد کی طرف متوجہ کرتے ہیں ؎

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

مسلمان عوام

پوری دنیا میں مسلمان عوام دین سے محبت کرتے ہیں اور دینی شعائر کا احترام کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ وہ تین کم زوریوں کا شکار ہیں۔ ایک کم زوری یہ ہے کہ اُن کے اندر دین کا علم بہت کم اور محدود ہے۔ عموماً دین کے بارے میں اُن کی معلومات کا ذریعہ وہ باتیں ہیں جو انھوں نے مختلف مجالس میں سُن رکھی ہیں، جو غلط اور صحیح کا ملغوبہ ہیں۔ دین کے سرچشموں ـــــ قرآن وسنت ـــــ سے عوام کا رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے اور بعض نادان مخلصین اور ہوشیار مفسدین برابر یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ عوام قرآن وسنت سے واقف نہ ہونے پائیں۔

مسلمان عوام کی دوسری کم زوری اخلاقی پستی ہے۔ مغربی استعمار کی غلامی کی دو صدیوں نے اُن کے اخلاق وکردار کو بگاڑ دیا ہے۔ رسمی آزادی حاصل ہوجانے کے بعد مسلمانوں کی حکومتوں نے عموماً عوام کی دینی واخلاقی تربیت کا کوئی اہتمام نہیں کیا ہے۔ اس کے برعکس بگاڑ کے لیے ذرائعِ ابلاغ جو کوشش کرتے ہیں، حکومتیں اُن کی سرپرستی کرتی ہیں۔ عوام کی ایک قابلِ ذکر تعداد اپنی معیشت کے سلسلے میں حلال وحرام کی قیود سے ناواقف یا اُن سے بے پروا ہے۔ اصلاح وتلقین کرنے والے بھی عموماً اپنی گفتگو میں معیشت کو موضوعِ بحث نہیں بناتے۔ بددیانتی اور غیر ذمہ داری کے ساتھ مفاد پرستی بھی عام ہے۔ اپنے مفاد کے لیے لوگ مفسدین کا آلۂ کار

بننے کے لیے یا اُن کی لیڈری وسیادت قبول کرنے کے لیے بہ آسانی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ دین سے لگاؤ کے باوجود فرض عبادات تک سے عوام کا ایک بڑا حصہ غافل ہے۔

عوام کی ایک تیسری کم زوری غلط مذہبیت ہے۔ تعویذ، گنڈے اور غیر مسنون اذکار اس کی علامت ہیں۔ جب یہ بگاڑ آگے بڑھتا ہے تو مشرکانہ رسومات اور عرسوں کے اہتمام کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پیر اور مرشد کے ساتھ عقیدت میں غلو کیا جاتا ہے اور اس کی غیر مشروط اطاعت درست سمجھی جاتی ہے۔ بدعات کو بلا تکلف قبول کر لیا جاتا ہے اور قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ اصل دین پر خود ساختہ مذہبی رسوم ورواج کا بھاری بوجھ ڈال دیا جاتا ہے جو دین کی پُرکشش شبیہ کو چھپا دیتا ہے اور سلیم الفطرت طبیعتیں دین کی طرف راغب ہونے کے بجائے اس سے متنفر ہونے لگتی ہیں۔

یہ سمجھنا خام خیالی ہے کہ عوام کی دین سے محبت اور دینی شعائر سے اُن کی عقیدت، اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی کے لیے کافی ہے اور عوام کی مندرجہ بالا کم زوریوں کو دور کرنے کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ حقیقتِ واقعہ اس کے برعکس ہے۔ عوام میں پائی جانے والی ان خرابیوں کی اصلاح کے بغیر اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی بہت مشکل ہے۔ جس طرح دستور اور قانون کے اندر اصلاح درکار ہے، اسی طرح عوام کی اصلاح کے لیے بھی منصوبہ بند کوشش ضروری ہے۔ بگڑا ہوا مسلم معاشرہ اسلامی نظام کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اسلامی تحریک کو معاشرے کی ہمہ جہتی اصلاح کے لیے کام کرنا ہوگا۔ بلاشبہ ایک صالح حکومت معاشرے کے سدھار کا کام بڑے پیمانے پر کر سکتی ہے، لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ حکومت ہی اس سلسلے میں واحد مؤثر عامل ہے۔ معاشرے کو متاثر کرنے والے بہت سے عوامل ایسے بھی ہوتے ہیں جو حکومت کے کنٹرول میں نہیں ہوتے۔ اس لیے معاشرے کی اصلاح اور حکومتی ڈھانچے میں تبدیلی دونوں کی ضرورت ہے۔

نئی نسل

مسلمانوں کی نئی نسل دین سے محبت میں اپنے بزرگوں سے پیچھے نہیں، البتہ دو باتیں اُسے دین اور دین دار لوگوں سے دور کرتی ہیں: (الف) مسلمانوں کے مسلکی جھگڑے اور

(ب) دین دار لوگوں کے کردار کی پستی ۔تحریک اسلامی کا کام یہ ہے کہ اس نئی نسل کے سامنے دین کی وہ تصویر پیش کرے جو اِن کم زوریوں سے پاک ہو۔نئی نسل کو اللہ کے دین کے حقیقی پیغام سے واقف ہونا چاہیے، جو اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے، پھر اُن کے سامنے یہ بات بھی آنی چاہیے کہ اختلاف کی جائز حدود کیا ہیں؟ اور ایسے اختلافات کے باوجود اتحادِ عمل کی راہ کیا ہے؟ اس طرح یہ بھی ضروری ہے کہ تحریکِ اسلامی نوجوان نسل کو اُن دین دار افراد سے متعارف کرائے جن کا اخلاق بلند اور کردار بے داغ ہے۔اللہ کے فضل سے ماضی میں بھی امت میں بلند کردار افراد موجود تھے اور آج بھی وہ امت کی زندگی کی علامت ہیں۔

مسلمانوں کی نئی نسل خواندگی اور تعلیم کے اعتبار سے اپنے بزرگوں سے آگے ہے۔تعلیم نے اُسے مغربی کلچر سے روشناس کرایا ہے۔جمہوریت کے نعرے اس نے سُنے ہیں اور اُس کے مظاہر دیکھے ہیں۔ٹکنالوجی اور سائنس کی ترقی کا اثر اُس نے قبول کیا ہے۔تحریکِ اسلامی کو چاہیے کہ اس پس منظر میں نئی نسل کی رہ نمائی کرے۔مغربی کلچر کا ایک وصف بحث و گفتگو کی آزادی ہے۔ اخلاقی حدود کی پابندی کے ساتھ اسلام اس کا قائل ہے۔ اسی طرح ذرائعِ ابلاغ اور ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کو اسلام درست سمجھتا ہے، بشرطے کہ یہ استفادہ حدود اللہ کے دائرے میں ہو اور اُن ضوابط کے تحت ہو جو اللہ نے مقرر کیے ہیں۔اسلام اُس طرزِ حکومت کا قائل ہے، جس میں حکم راں، عوام کی مرضی سے چُنے جائیں اور اس سلسلے میں معاصر رجحان کی تائید اسے حاصل ہے۔تحریکِ اسلامی مسلمانوں کی نئی نسل کو ان تمام امور کے سلسلے میں اسلام کے نقطۂ نظر سے آگاہ کرسکتی ہے اور یہ کام اسے ضرور کرنا چاہیے۔

عالمِ اسلام میں برپا عوامی تحریک میں نئی نسل نے اہم رول ادا کیا ہے۔ابھی تک اُن کی دل چسپی زیادہ تر جمہوریت کی بحالی سے ہے۔اب اُن کے سامنے وہ سارے پہلو بھی آنے چاہئیں جن میں مغربی جمہوریت اصلاح کی محتاج ہے۔تحریکِ اسلامی یہ تجزیہ پیش کرے تو نئی نسل کو اسلامی نقطۂ نظر پر مطمئن کرنا کوئی مشکل امر نہ ہوگا۔اسی طرح یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ جمہوریت سیاسی نظام کے محض ایک پہلو کا نام ہے۔سیاسی نظام کے سلسلے میں اساسی سوال یہ ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں کے سلسلے میں ہدایت کہاں سے اخذ کی جائے گی؟ اسلام کے نزدیک

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس ہدایت کا ماخذ اللہ تعالیٰ کی رہ نمائی ہے، جو اس کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت میں موجود ہے۔تحریکِ اسلامی کو چاہیے کہ اس نقطۂ نظر سے نئی نسل کو واقف بھی کرائے اور انھیں مطمئن بھی کرے۔

سیکولرزم کے حق میں ذرائعِ ابلاغ کا پروپیگنڈا جاری ہے۔تحریکِ اسلامی کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ سیکولرزم کے تجربے کا تنقیدی جائزہ لے کر بتائے کہ وہ انسانی مسائل حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔سیکولر تہذیب تین صدیوں سے دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکم راں ہے۔اس نے دنیا میں امن کے قیام کے بجائے دنیا کو استعماری طاقتوں کا غلام بنا دیا ہے۔سیکولر ٹکنالوجی نے خشکی اور تری میں فساد برپا کر کے دنیا کو ماحولیاتی بحران سے دوچار کیا ہے۔سیکولر نظریے کے تحت اباحیت اور بے حیائی کو فروغ ملا ہے۔انسانی قدریں پامال ہو رہی ہیں اور خاندان بکھر رہے ہیں۔

مسلمان حکم راں طبقہ

مسلمانوں کے حکم راں طبقے میں مخلص اور باکردار افراد بھی موجود ہیں، لیکن بہت کم۔ اس طبقے کی اکثریت تین بڑی کم زوریوں کا شکار ہے۔(الف) دین سے ناواقفیت اور اس سے بے پروائی (ب) کردار کی پستی اور مسرفانہ طرزِ زندگی (ج) مفاد پرستی اور مغرب سے مرعوبیت۔ ان کم زوریوں نے اُن کو بزدلی اور خوف میں بھی مبتلا کر دیا ہے اور وہ بہ آسانی اپنے ملک اور امتِ مسلمہ کے خلاف غداری پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

اِن حالات میں تحریکِ اسلامی کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے پر توجہ کرے۔حکم راں عموماً اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔تعلیم یافتہ افراد میں مندرجہ بالا کم زوریاں پائی جائیں تو اُن کی اصلاح کی ہمہ جہتی کوشش کی جانی چاہیے۔یہ مسلم معاشرے کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔دوسری طرف مسلمان عوام کو اس جانب متوجہ کیا جانا چاہیے کہ اگر حکم رانوں کا انتخاب اُن کے اختیار میں ہو تو وہ ایسے افراد کو منتخب کریں جو ان نمایاں کم زوریوں سے پاک ہوں۔

یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ عالمِ اسلام حقیقی سیاسی آزادی اُس وقت تک حاصل نہیں کرسکتا اور اسے برقرار نہیں رکھ سکتا، جب تک وہ صنعت وحرفت اور سائنس وٹکنالوجی

کے میدانوں میں قابلِ لحاظ ترقی نہ کرلے۔یہ ترقی اس حد تک ہونی چاہیے کہ عالمِ اسلام معاشی، تکنیکی اور حربی پہلو سے خود کفیل (Self Reliant) ہو جائے۔اس کیفیت کے بغیر حکم رانوں کی نیک کرداری بھی ملک کو غلامی سے نہیں بچاسکتی۔خود کفیل ہونے کے لیے منصوبہ بند کوشش درکار ہے۔عالمِ اسلام کے تمام عناصر کو اس سلسلے میں کام کرنا ہوگا اور تحریکِ اسلامی ان کوششوں میں تعاون پیش کرسکتی ہے۔خواندگی کا اہتمام، تعلیم کی ترقی، سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ کے لیے اداروں کا قیام، صنعت وحرفت نیز زراعت کی ترقی کا اہتمام اور ان کاموں کے لیے ضروری وسائل کی فراہمی درکار ہے۔ان تمام امور میں مسلمان ممالک کا آپسی تعاون بھی ضروری ہے۔ ملک کی آزادی کے لیے بنیادی شرط تو آزادی کی طَلَب اور اس کے حصول کا جذبہ ہے، لیکن اس کو برقرار رکھنے کے لیے خود کفیل ہونا بھی شرط ہے۔

دینی جماعتیں اور علماء

بہت سے روایتی دینی حلقے جماعتِ اسلامی اور اخوان المسلمون سے مختلف امور میں اختلاف کرتے رہے ہیں اور یہ جماعتیں اُن کی تنقید کا ہدف بھی بنی ہیں۔اس واقعے کے باوجود ایسے افراد ان حلقوں میں ہمیشہ پائے جاتے رہے ہیں جنھوں نے جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون کے کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

اس تنقید کے باوجود، جو بعض دینی حلقوں کی طرف سے کی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تحریک کی نمائندہ تنظیمیں اور روایتی دینی حلقے اپنی اصل حیثیت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے معاون ہیں، چنانچہ اسلامی نظام کے قیام کی جانب پیش رفت میں تحریکِ اسلامی کو اُن تمام عناصر کا تعاون حاصل ہونا چاہیے جو دین کے لیے مخلص ہیں اور دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

اس تعاون کے راستے میں آخر کیا چیز رکاوٹ ہے؟ اِس سوال پر غور کیا جائے تو دو ممکن رکاوٹوں کی نشان دہی کی جاسکتی ہے: (الف) تنگ نظری اور جماعتی ومسلکی عصبیت اور (ب) مفاد پرستی۔

چنانچہ اسلامی تحریک کوکوشش کرنی چاہیے کہ خوداس کا دامن اِن کم زوریوں سے پاک ہو۔ پھراُسے اِس طرف توجہ کرنی چاہیے کہ دینی حلقوں اور جماعتوں میں وسیع النظری اور باہمی تعاون کی فضا فروغ پائے۔اس سلسلے میں نوجوانوں سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔عموماً اُن کے مزاج میں گروہی عصبیت کے بجائے حق پسندی غالب ہوتی ہے اور مفاد پرستی کے بجائے اُن میں راہِ حق میں قربانی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

حالات پر اثر انداز ہونے والا آخری اہم عامل مغربی طاقتیں ہیں۔مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام اپنے استعماری عزائم کے ساتھ پوری دنیا پر مسلط ہونے کی کوشش کررہا ہے۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے، وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، اسلام کی دعوت اُن تک پہنچنی چاہیے۔اسی طرح ہرفرد، چاہے وہ حکم راں طبقے سے تعلق رکھتا ہو، اس کا مستحق ہے کہ اُس کوفلاح ونجات کی راہ دکھائی جائے ،لیکن جہاں تک جبر واستبداد پر مبنی عالمی سرمایہ داری کے نمائندے استعماری نظام کا تعلق ہے،اس کے خلاف مسلسل، منصوبہ بند اور انتھک جدوجہد کی ضرورت ہے۔تحریکِ اسلامی کا کام یہ ہے کہ اس عظیم جدوجہد کے سلسلے میں انسانوں کی رہ نمائی کرے۔اس راستے میں اُسے دنیا کے اُن تمام عناصر کا تعاون حاصل ہوگا جواللہ کی زمین پر عدل وانصاف کا قیام چاہتے ہیں۔

اسلامی تحریک کا طریقِ کار

دنیا کے ہر گوشے میں ایسی تنظیمیں موجود ہیں جو اسلامی خطوط پر معاشرے کی تعمیرِ نو اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کوشش کر رہی ہیں۔ ایسی کوششوں کو 'تحریکِ اسلامی' کہا جاتا ہے۔ مسلمان دنیا تحریکِ اسلامی سے بڑی حد تک واقف ہے اور اب غیر مسلم دنیا اور عالمی ذرائعِ ابلاغ بھی اس سے واقف ہو رہے ہیں، اگرچہ وہ اس کے بارے میں متعدد غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ تحریکِ اسلامی کے بارے میں متعدد سوالات مختلف حلقوں کی جانب سے اٹھائے جاتے ہیں، جن کا تعلق اس کے مقصد اور طریقِ کار سے ہے۔ سطورِ ذیل میں چند سوالات کا جائزہ پیشِ نظر ہے۔

حاکمیتِ الٰہ کا تصور

تحریکِ اسلامی کے بارے میں ایک سوال یہ ہے کہ اس نے اپنے اساسی پیغام میں حاکمیتِ الٰہ کو نمایاں اور مرکزی مقام کیوں دیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے قبل مناسب ہوگا کہ 'حاکمیتِ الٰہ' کی اصطلاح کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ اس اصطلاح کا مفہوم دستورِ جماعت اسلامی ہند میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ''......بنیادی عقیدہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ یعنی الٰہ صرف اللہ ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اس عقیدے کے پہلے جز یعنی اللہ تعالیٰ کے واحد الٰہ ہونے اور کسی دوسرے کے الٰہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہی اللہ ہم سب انسانوں کا معبودِ برحق اور حاکمِ تشریعی ہے، جو ہمارا اور اس پوری کائنات کا

خالق، پروردگار، مدبر، مالک اور حاکمِ تکوینی ہے۔ پرستش کا مستحق اور حقیقی مطاع صرف وہی ہے اوران میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں۔

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ نہ سمجھے، کسی کو بہ اختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز تسلیم نہ کرے، کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اوران تمام اطاعتوں کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کردے جوایک اللہ کی اطاعت اوراس کے قانون کے تحت نہ ہوں، کیوں کہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اوراپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔اس کے سوا کسی کو فی الواقع مالکیت اور حاکمیت کا حق ہی نہیں پہنچتا۔

نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت ماننے اور صرف اسی ضابطے کو ضابطہ تسلیم کرے، جو اللہ کا مقرر کردہ ہو، یااس کے احکام وہدایات کے تحت ہو،اور جواس کے خلاف ہو، اسے رَد کردے۔اپنی زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی کتاب اوراس کے رسول کی سنت ہی کو اصل حجت، سند اور مرجع قرار دے۔ جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب وسنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرے اور جو اُن کے خلاف ہو اسے ترک کردے۔'' (دستورِ جماعت اسلامی ہند، دفعہ ۳)

مندرجہ بالا تصور حاکمیتِ الٰہ قرآن مجید سے اخذ کیا گیا ہے۔مثال کے طور پر ذیل کی آیات پر غور کیا جاسکتا ہے:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (البقرۃ:۱۰۷)

''کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی، اللہ ہی کے لیے ہے۔''

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (الانعام:۵۷)

''فیصلے کا اختیار کسی کو نہیں ہے سوائے اللہ کے۔''

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ (الشوریٰ:۱۰)

''تمہارے درمیان جو اختلاف بھی ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔''

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف:۴۰)

''حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ (الاعراف:۳)

''پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے، تمہارے رب کی طرف سے۔ اور اسے چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔''

قرآن مجید کی ان صریح تعلیمات کی روشنی میں معقول موقف وہی ہے جو تحریکِ اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ یعنی یہ کہ حاکمیتِ الٰہ کو دینی نظامِ تصورات میں مرکزی اور نمایاں مقام حاصل ہونا چاہئے۔

اسلامی حکومت

اسلامی تحریک کے سلسلے میں بعض افراد کا تردّد یہ ہے کہ وہ اسلامی حکومت کا قیام چاہتی ہے۔ سوال پیش کیا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کو مقصود اور ضروری قرار دینے کی کیا دلیل ہے؟ اس سلسلے میں ذیل کی آیات پر غور کرنا چاہیے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ (المائدۃ:۴۸)

''ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے جو تصدیق کرتی ہے پہلی آئی ہوئی کتابوں کی اور نگہبان ہے اُن پر۔ پس جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے تم اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی میں اس حق سے منہ نہ موڑو جو تمہارے پاس آیا ہے۔''

ظاہر ہے کہ کتابِ الٰہی کے مطابق فیصلے کرنے کے لیے اقتدار درکار ہے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (النساء:۵۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے کچھ اولی الامر ہونے چاہئیں جن کی ان کو اطاعت کرنی چاہیے۔ بہ الفاظِ دیگر، مسلمانوں کو اجتماعی نظم کے تحت زندگی گزارنی چاہیے۔ یہی نظامِ سمع و طاعت اپنی وسیع شکل میں اسلامی حکومت کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (الحدید:۲۵)

''ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں، اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ دیکھے کہ کون اس کو دیکھے بغیر، اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہاں لوہے سے مراد، سیاسی اور جنگی طاقت ہے اور کلام کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو قیامِ عدل کی محض ایک اسکیم پیش کر دینے کے لیے مبعوث نہیں فرمایا تھا، بلکہ یہ بات بھی ان کے مشن میں شامل تھی کہ اس (قیامِ عدل کی اسکیم) کو عملاً نافذ کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ قوت فراہم کی جائے جس سے فی الواقع عدل قائم ہو سکے، اسے درہم برہم کرنے والوں کو سزا دی جا سکے اور اس کی مزاحمت کرنے والوں کا زور توڑا جا سکے۔'' (ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو آسمانی کتاب سے راہِ راست پر نہ آئیں اور انصاف کی ترازو کو دنیا میں سیدھا نہ رکھیں، ضرورت پڑے گی کہ ان کی گوشمالی کی جائے اور ظالم و کج رو معاندین پر اللہ و رسول کے احکام کا وقار و اقتدار قائم رکھا جائے۔''

علانیہ جدوجہد

بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ تحریکِ اسلامی علانیہ جدوجہد کیوں کرتی ہے اور خفیہ طریقے استعمال کر کے سرعت کے ساتھ انقلاب کیوں نہیں لے آتی؟ اس سوال کا مدلل جواب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ان الفاظ میں دیا ہے:

''خفیہ تنظیموں میں چند افراد مختارِ کُل بن جاتے ہیں اور پھر ساری تنظیم یا تحریک اُن ہی کی مرضی پر چلتی ہے۔ اُن سے اختلاف کرنے والوں کو فوراً ختم کر دیا جاتا ہے، ان کی پالیسی سے اظہارِ بے اطمینانی سخت ناگوار اور ناپسندیدہ قرار دی جاتی ہے۔ اَب آپ خود سوچیں کہ یہی چند افراد جب برسرِ اقتدار آئیں گے تو کس قدر بدترین ڈکٹیٹر ثابت ہوں گے......

میرا مشورہ یہی ہے کہ خواہ آپ کو بھوکا رہنا پڑے، گولیاں کھانی پڑیں، مگر صبر کے ساتھ، تحمل کے ساتھ، کھلم کھلا علانیہ طور پر اپنی اصلاحی تحریک کو قانون، ضابطے اور

اخلاقی حدود کے اندر چلاتے رہیے۔خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریق کار بھی علانیہ اور کھلم کھلا تبلیغ کا طریقہ تھا۔" (تصریحات)

مولانا اس ضمن میں مزید کہتے ہیں:

"جب تک ہمت اور جرأت اور عزم و استقلال کے ساتھ برسرزمین (Openly) کام نہیں کیا جائے گا، اسلامی ریاست قائم نہیں ہوسکتی۔زیرِ زمین (Under Ground) کام کے نتیجے میں اسلامی ریاست نہیں بن سکتی......

درحقیقت جب تک برسرِ زمین کام کر کے عام لوگوں کے خیالات کو تبدیل نہیں کیا جائے گا، اُن کو پوری طرح ہم خیال نہیں بنایا جائے گا اور معاشرے کو اسلامی نظام کے لیے تیار نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک اسلامی ریاست کے قیام کا کوئی امکان نہیں ہے۔" (ایضاً)

لاقانونیت سے اجتناب

سطورِ بالا میں عرض کیا گیا تھا کہ بعض دوستوں کو علانیہ جدوجہد پر اعتراض ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی تیز رفتار خفیہ طریقہ اختیار کر کے جلد انقلاب لے آیا جائے اور علانیہ طریقوں پر اصرار نہ کیا جائے۔ اس کے بالکل برعکس بعض حلقوں کو یہ بدگمانی ہے کہ اسلامی تحریک تخریبی طریقے اختیار کرتی ہے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ بدگمانی بالکل بے بنیاد ہے۔اسلامی تحریک کا اصولی موقف یہ ہے کہ فساد فی الارض سے بچا جائے۔طریقِ کار کے ذیل میں جماعت اسلامی ہند کے دستور میں کہا گیا ہے:

"جماعت اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابند ہوگی اور کبھی ایسے ذرائع یا طریقے استعمال نہ کرے گی جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں، یا جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کشمکش اور فساد فی الارض رونما ہو......

وہ تبلیغ وتلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔'' (دستورِ جماعت اسلامی ہند، دفعہ ۵)

لاقانونیت سے اجتناب کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا صدرالدین اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''موجودہ نظامِ (باطل) کو اصولی اور اعتقادی طور پر غلط، فاسد اور قابلِ رد قرار دینے کے باوجود، جہاں تک عام قوانینِ ملکی کا تعلق ہے، تحریکِ اسلامی اس بات کو صحیح نہیں سمجھتی کہ عملاً بھی اُن کو رد کر دیا جائے۔ چنانچہ اس بارے میں اُس کی ہدایت یہ ہے کہ ان قوانین کو اصلاً غلط اور باطل سمجھنے کے باوجود، عملی پابندی ان کی ضروری کی جائے، اِلّا یہ کہ بالفرض کوئی قانون ہی ایسا ہو جس کی پیروی سے شریعت کی کھلی ہوئی خلاف ورزی اور اللہ و رسول کی راست نافرمانی لازم آتی ہو۔ عام ملکی قوانین کی عملی پابندی کا یہ مسلک، اُس نے کسی مصلحت یا سیاسی ضرورت کی بنا پر اختیار نہیں کیا ہے، بلکہ خود اسوہ انبیاءؑ ہی کی روشنی میں اختیار کیا ہے۔

اس اسوے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غلط نظام بھی جب تک قائم اور نافذ ہو، اس وقت تک اس کے عام قوانین کی عملی پابندی سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اصول اس واقعیت پسندی پر مبنی ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی بہ ہر حال کوئی نہ کوئی ضابطہ اور قانون چاہتی ہے۔ اس کے بغیر وہ قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ اب اگر وقت کے کارفرما قوانین کی پابندی ترک کر دی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زندگی یا تو جامد ہو کر رہ جائے گی، یا پھر اس میں نظم وضبط باقی نہ رہ جائے گا۔

پہلی صورت عملاً ناممکن ہے اور دوسری سرتاسر انتشار، انارکی (Anarchy) اور فتنہ و فساد کے ہم معنی ہے، اس لیے وہ بھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتی...... غلط سے غلط اور بد سے بدتر قوانین وضوابط کی حکم رانی بھی انسانی زندگی کے عمومی مصالح کے لیے انارکی اور

لاقانونیت سے بہ ہر حال کم تر درجے کی مصیبت ہے۔اس لیے شریعتِ اسلامی کا نقطۂ نظر اس باب میں بجا طور پر یہ ہے کہ ایک زیادہ سخت اور تباہ کن مصیبت سے بچنے کے لیے کسی باطل، نظامِ غالب کے قوانین کی پابندی کی نسبتاً چھوٹی مصیبت کو لازماً گوارا کیا جائے۔'' (تحریکِ اسلامی ہند، باب ۸)

اس اقتباس سے واضح ہے کہ لاقانونیت سے اجتناب اسلامی تحریک کا ایک لازمی وصف ہے۔اس بنا پر تخریبی طریقے اختیار کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

قیامِ خلافت

بعض دوستوں کا اعتراض یہ ہے کہ تحریکِ اسلامی نے 'اسلامی حکومت' کے قیام کو اپنی منزل کے طور پر پیش کیا ہے، جبکہ اسے 'احیائے خلافت' کو اپنا مقصود قرار دینا چاہیے تھا۔ اس اعتراض کے سلسلے میں تین حقیقتیں پیش نظر رہنی چاہئیں:

(الف) پہلی حقیقت یہ ہے کہ اصولی طور پر اقامتِ دین کا کام کسی جغرافیائی خطے میں محدود نہیں ہے۔ اقامتِ دین کی اصطلاح میں لفظ 'دین' کا مفہوم دستور جماعت اسلامی ہند میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ''لفظ دین سے مراد وہ دینِ حق ہے، جسے اللہ رب العالمین، اپنے تمام انبیاء کے ذریعے مختلف زمانوں اور ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے نازل فرمایا اور جو اَب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عنداللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام 'اسلام' ہے۔'' (دستورِ جماعت اسلامی ہند، دفعہ ۴)

اس تشریح سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دین عالم گیر ہے، چنانچہ اس کے قیام کا فریضہ بھی تمام دنیا کے مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔ البتہ دنیا اس وقت مختلف حکومتوں کے زیرِ انتظام علاقوں میں تقسیم ہے، اس لیے ان مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے لیے فی الحال یہ ممکن نہیں ہے کہ

کارِ اقامتِ دین کے لیے وہ ایک مشترک تنظیمی ہیئت بنا سکیں۔ لامحالہ اس صورت حال میں یہ ضروری ہوگا کہ ہر ملک میں وہاں کے حالات کے پیشِ نظر مناسب تنظیمی ہیئت اقامتِ دین کے مقصد کے لیے بنائی جائے۔ اس سے دین یا کارِ اقامتِ دین کی عالم گیری کی نفی نہیں ہوتی۔

(ب) دوسری حقیقت، جو پیشِ نظر رہنی چاہیے، یہ ہے کہ اقامتِ دین کا مثالی نمونہ خلافت راشدہ کا نمونہ ہے۔ چنانچہ اقامتِ دین کی عملی سرگرمیوں کے کسی ایک خطے یا ملک میں محدود ہونے کے باوجود اس مثالی نمونے (Ideal) کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جائے گا۔ دستورِ جماعت اسلامی ہند میں کہا گیا ہے:

> ''اس دین کی اقامت کا مثالی اور بہترین عملی نمونہ وہ ہے جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے قائم فرمایا۔'' (ایضاً)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

> ''خلافتِ راشدہ کا دور...... ایک روشنی کا مینار تھا، جس کی طرف بعد کے ادوار میں فقہاء و محدثین اور عام دین دار مسلمان ہمیشہ دیکھتے رہے اور اسی کو اسلام کے مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی نظام کے معاملے میں معیار سمجھتے رہے۔'' (خلافت وملوکیت)

(ج) تیسری حقیقت جو سامنے رہنی چاہیے، یہ ہے کہ کسی ایک ملک میں اسلامی حکومت کا قیام ایک مرحلہ ہے، جو عالمی خلافت کے احیاء کی جانب سفر کے دوران پیش آئے گا۔ چنانچہ کسی ملک میں اسلامی حکومت کے قیام کو آخری منزل سمجھنا درست نہ ہوگا۔ ملکی سطح کی اسلامی حکومتوں کے قیام کے بعد وہ مرحلہ آئے گا جہاں عالمی خلافت کا انعقاد ممکن ہو سکے گا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

> ''(اسلامی ریاست) ایک ایسی ریاست ہے جو رنگ، نسل، زبان یا جغرافیہ کی عصبیتوں کے بجائے صرف اصول کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ زمین کے ہر گوشے میں نسلِ انسانی کے جو افراد بھی چاہیں، ان اصولوں کو قبول کر سکتے ہیں اور کسی امتیاز و تعصب کے بغیر بالکل مساوی حقوق کے ساتھ اس نظام میں شامل ہو سکتے ہیں۔ دنیا

جمہوریت

بعض احباب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اسلامی تحریک نے جمہوریت کی تائید شروع کردی ہے، جب کہ جمہوریت ایک غیر اسلامی نظریہ ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ۱۹۶۸ء میں ایک سوال پوچھا گیا تھا۔ سوال یہ تھا:

''اسلامی مفکرین نے موجودہ صدی میں متعدد مغربی اصطلاحیں استعمال کی ہیں مثلاً ڈیموکریسی، نیشنلزم، وطنیت، پارلیمنٹ، دستور، سوشلزم وغیرہ۔ بعض اسلامی مفکرین ان اصطلاحوں کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔ کیا آپ اپنے تجربات کی روشنی میں بتاسکتے ہیں کہ آئندہ ایسے اسلامی مفکرین پیدا ہوں گے جو ہر اس چیز کو کلیتاً رَد کردیں گے جو قرآن وسنت سے خارج ہوگی۔'' (تصریحات)

مولانا مودودیؒ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا تھا:

''موجودہ زمانے کے لوگوں کو (اپنی) بات سمجھانے کے لیے جدید اصطلاحات کا استعمال تو ناگزیر ہے، لیکن ان کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض اصطلاحوں سے پرہیز اولیٰ ہے، بلکہ اجتناب واجب ہے، مثلاً اشتراکیت۔ بعض کا استعمال اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اُن کے اسلامی مفہوم اور مغربی مفہوم کا فرق پوری طرح واضح کردیا جائے، مثلاً جمہوریت یا دستوریت یا پارلیمنٹری سسٹم۔ بعض (اصطلاحات) کو سرے سے کوئی اسلامی مفہوم دیا ہی نہیں جاسکتا، مثلاً نیشنلزم۔ (ایضاً)

ایک سال بعد ۱۹۶۹ء میں مولانا مودودیؒ سے اسی موضوع سے متعلق ایک اور مجلس میں سوال پوچھا گیا، جو یہ تھا:

''مولانا! جب اسلامی جمہوریت کی اصطلاح بولی جاتی ہے تو اسے درست قرار دیا جاتا ہے۔ کیا اس طرح اسلامی سوشلزم کی اصطلاح بھی درست نہیں ہوسکتی؟''

(۵-اے ذیلدار پارک)

مولانا نے اس سوال کے جواب میں فرمایا:

''جمہوریت سے مراد وہ سیاسی نظام ہے جس میں حکومت عوام کی مرضی سے بنے، عوام کی مرضی سے قائم رہے اور عوام کی مرضی سے تبدیل ہو سکے۔ اب جمہوریت کا ایک مغربی تصور ہے اور دوسرا اسلامی تصور ہے۔

مغربی تصور یہ ہے کہ اس میں اقتدارِ اعلیٰ کے مالک عوام ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی قانون سازی میں آخری فیصلہ کُن حیثیت عوام کی مرضی کو حاصل ہوتی ہے۔ عوام کی اکثریت حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر سکتی ہے۔

اس کے برعکس اسلامی جمہوریت یہ ہے کہ حکومت تو اس میں بھی عوام کی مرضی سے بنتی ہے، عوام ہی کی مرضی سے قائم رہتی ہے اور انہی کی مرضی سے تبدیل ہو سکتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ جمہوریت کے اسلامی تصور کے مطابق اقتدارِ اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور مسلمانوں کو قانون سازی کا اختیار صرف شریعتِ اسلامی کے مقرر کردہ حدود کے اندر ہے۔ ان حدود سے باہر جا کر وہ کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ وہ سارے کے سارے مل کر بھی خدا کے کسی حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کر سکتے۔ ان معنوں میں مغرب کی مطلق العنان اور بے قید جمہوریت کے مقابلے میں یہ ایک حدود آشنا جمہوریت ہے اور اسی مناسبت سے اس کے لیے اسلامی جمہوریت کی اصطلاح استعمال کرنا درست ہے۔ گویا اگر Sovereignty (اقتدارِ اعلیٰ) کے مغربی تصور کو اقتدارِ اعلیٰ کے اسلامی تصور سے بدل دیا جائے تو تمام مفاسد کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

اس کے برعکس اسلامی سوشلزم کی اصطلاح اس لیے غلط ہے کہ سوشلزم محض کسی سیاسی نظام کا نام نہیں ہے، بلکہ سوشلزم ایک Ideology (نظریۂ زندگی) ہے اور اپنے ہمہ گیر سیاسی اور اجتماعی پروگرام کی وجہ سے ایک ایسے نظام کی حیثیت رکھتا ہے جس کا کوئی جز اس کے کل سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک علیحدہ مذہب ہے۔ اس کا تصورِ انسان اور تصورِ کائنات اسلام کے تصورِ انسان و کائنات سے یکسر

مختلف اور متصادم ہے۔اس کی تعبیرِ تاریخ سراسر مادّی ہے اوراس میں روحانیت اور مذہب کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔اس لحاظ سے اس کے ساتھ لفظ اسلامی کا اضافہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اسلامی عیسائیت یا اسلامی بودھ ازم وغیرہ کہہ کرانھیں مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کرے۔'' (ایضاً)

خلافتِ راشدہ کے بارے میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں روحِ جمہوریت پائی جاتی تھی۔فرماتے ہیں:

''اس خلافت کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ اس میں تنقید اور اظہارِ رائے کی پوری آزادی تھی اور خلفاء ہر وقت اپنی قوم کی دست رس میں تھے۔وہ خود اپنے اہلِ شوریٰ کے درمیان بیٹھتے اور مباحث میں حصہ لیتے تھے۔ان کی کوئی سرکاری پارٹی نہ تھی، نہ اُن کے خلاف کسی پارٹی کا کوئی وجود تھا۔آزادانہ فضامیں ہر شریکِ مجلس اپنے ایمان وضمیر کے مطابق رائے دیتا تھا۔تمام معاملات اہلِ حل وعقد کے سامنے بے کم وکاست رکھ دیے جاتے اور کچھ چھُپا کر نہ رکھا جاتا۔فیصلے دلیل کی بنیاد پر ہوتے تھے نہ کہ کسی کے رعب واثر، یا کسی کے مفاد کی پاسداری یا کسی جتھہ بندی کی بنیاد پر۔

پھر یہ خلفاء اپنی قوم کا سامنا صرف شوریٰ کے واسطے ہی سے نہ کرتے تھے، بلکہ ہر روز پانچ مرتبہ نمازِ باجماعت میں، ہر ہفتے جمعہ کے اجتماع میں، ہر سال عیدین اور حج کے اجتماعات میں اُن کو قوم سے اور قوم کو اُن سے سابقہ پیش آتا تھا۔ان کے گھر عوام کے درمیان تھے اور کسی حاجب ودربان کے بغیر ان کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے تھے۔وہ بازاروں میں کسی محافظ دستے، کسی ہٹو بچو کے اہتمام کے بغیر، عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔ان تمام مواقع پر ہر شخص کو انھیں ٹوکنے، ان پر تنقید کرنے اوران سے محاسبہ کرنے کی کھلی آزادی تھی۔اس آزادی کے استعمال کی وہ محض اجازت ہی نہ دیتے تھے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔'' (خلافت وملوکیت)

ان تصریحات سے درجِ ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

۱۔ اسلامی تحریک حاکمیتِ الٰہ کی علم بردار ہے اور دیگر تمام حاکمیتوں کو رد کرتی ہے، جن میں حاکمیتِ جمہور بھی شامل ہے۔

۲۔ اسلامی تحریک اس اصول کی تائید کرتی ہے کہ شریعتِ الٰہی کے نفاذ کے لیے جو حکومت تشکیل پائے اس میں عوام کو حکم رانوں پر تنقید اور ان کے احتساب کی پوری آزادی حاصل رہنی چاہیے۔

اس مزاج کی بنا پر اسلامی تحریک ایک طرف تو جمہور کی حاکمیت کے بجائے اللہ کی حاکمیت کی طرف انسانوں کو دعوت دیتی ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی ضروری سمجھتی ہے کہ عوام کا حقِ تنقید واحتساب جس حد تک کسی ملک کے نظام میں موجود ہو، وہ باقی رہے اور اس میں اضمحلال نہ آنے پائے۔ حاکمیتِ جمہور کی تردید اور طرزِ حکم رانی کی اچھی قدروں (جنھیں آج کل جمہوری قدریں کہا جاتا ہے) کی تائید میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ اسلامی حکومت میں حکم راں کون ہوں گے تو اس کا اصولی جواب اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی ہدایت میں موجود ہے (یعنی مسلمان اپنے معاملات باہم مشورے سے چلاتے ہیں) اس اصول کے عملی انطباق کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

> ''آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جانشینی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن مسلم معاشرے کے لوگوں نے خود یہ جان لیا کہ اسلام ایک شوروی خلافت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے وہاں نہ کسی خاندانی بادشاہی کی بنا ڈالی گئی، نہ کوئی شخص طاقت استعمال کر کے برسرِ اقتدار آیا، نہ کسی نے خلافت حاصل کرنے کے لیے خود کوئی دوڑ دھوپ یا برائے نام بھی اس کے لیے کوئی کوشش کی، بلکہ یکے بعد دیگرے چار اصحاب کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ بناتے چلے گئے۔ اس خلافت کو امت نے خلافتِ راشدہ (راست رو خلافت) قرار دیا ہے۔ اس سے خود بہ خود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کا صحیح طرز یہی ہے۔'' (ایضاً)

خلافتِ راشدہ میں رائج اس طرزِ عمل کی روشنی میں اسلامی مزاج کیا تقاضا کرتا ہے؟

اس کو مولانا مودودیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے:

''خلافت کے متعلق خلفائے راشدین اور اصحابِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا متفق علیہ تصور یہ تھا کہ یہ ایک انتخابی منصب ہے، جسے مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہونا چاہیے۔'' (ایضاً)

درجِ بالا اسلامی مزاج کا تقاضا یہ ہے کہ حکم رانوں کے انتخاب کے سلسلے میں مشورے اور عوام کی آزادانہ رضامندی پر مبنی معقول طریقے سے دنیا کو متعارف کرایا جائے۔ دنیا میں جو جمہوریت اس وقت رائج ہے، اس میں عوام کی آزادانہ رضامندی کے حصول کا تو کچھ اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن حکم رانوں کے انتخاب میں مشورے کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا۔ مزید برآں باہم متصادم پارٹیوں کی موجودگی، پارٹیوں کا اصولوں کے بجائے مفادات کا علم بردار ہونا، امیدواری کا طریقہ اور امیدواروں کے لیے کنویسنگ، موجودہ جمہوریت کے ایسے عناصر ہیں جو عوام کو صالح فضا میں باہم مشورے کا موقع نہیں دیتے۔ مشورے کے بجائے طاقت ور طبقات اور گروہ اپنے پسند کے افراد کو پروپیگنڈے اور وسائل کی طاقت کے ذریعے عوام پر مسلط کر دیتے ہیں۔ ان حالات میں عوام کی جو رائے حاصل کی جاتی ہے، وہ ان کی آزادانہ رضامندی کا مظہر نہیں کہی جا سکتی۔

اس پس منظر میں اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

(الف) بنیادی اصلاح، جو مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ حاکمیتِ جمہور کے بجائے حاکمیتِ الٰہ کو تسلیم کیا جائے۔

(ب) اخلاقی حدود کے اندر عوام کو تنقید و احتساب کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔

(ج) پارٹی سسٹم اور امیدواری پر مبنی موجودہ جمہوری طریقوں کے بجائے ایسے طریقے سوچے جانے چاہئیں جہاں حکم رانوں کے انتخاب کے سلسلے میں عوام کو آزادانہ مشورے کا موقع مل سکے۔

(د) حکم راں بہ ہر صورت وہی لوگ ہونے چاہئیں جنھیں عوام کی آزادانہ رضامندی سے حکم راں بنایا گیا ہو۔

(ہ) بادشاہی اور آمریت کے مقابلے میں دنیا میں جو جمہوری نظام موجود ہیں اُن کی اصولی اور عملی خرابیوں سے عوام کو آگاہ کرنا چاہیے۔ان خرابیوں کے باوجود عوام کی آزادانہ رضامندی کے اصول کو یہ جمہوری نظام تسلیم کرتے ہیں۔ یہ معقولیت، جو اِن نظاموں میں موجود ہے، تائیداور قدردانی کی مستحق ہے۔

(و) اگر کسی ملک میں یہ کوشش کی جارہی ہو کہ عوام کی آزادانہ رضامندی کے حصول پر مبنی جمہوری طرزِ انتخاب کو ختم کردیا جائے یا اسے کم زور اور بے اثر بنادیا جائے، تو ایسی ناروا کوشش کی مزاحمت کی جانی چاہیے۔

(ز) اگر تنقید واحتساب کی آزادی جیسی جمہوری قدروں اور فطری انسانی حقوق کو ختم کرنے یا مضمحل کرنے کی کوشش کی جارہی ہو تو ایسی منفی کوششوں کی بھی مزاحمت کی جانی چاہیے۔

اسلامی تحریک کا مندرجہ بالا نقطۂ نظر حقیقت پسندی اور اعتدال پر مبنی ہے۔ جتنی کچھ صالحیت اور معقولیت موجودہ دنیا کے طرزِ عمل میں موجود ہے، اس کی قدر کی جانی چاہیے اور اسے باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ افکار وتصورات، نظریات واقدار اور عملی طریقوں میں جس تبدیلی اور اصلاح کی ضرورت ہے، اس کی مسلسل نشان دہی کرتے رہنا بھی ضروری ہے۔

اسلامی اساس پر علوم کی تدوینِ نو

پچھلی صدی میں اسلامی تحریکات نے معاشرے کی اسلامی خطوط پر تعمیرِ نو کی دعوت دی۔ تعمیرِ نو کا ایک اہم جز 'علوم کی اسلامی اساس پر تدوین' ہے۔ اس پہلو کی طرف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور سید قطبؒ نے اپنی تحریروں میں توجہ دلائی۔ تقریباً پون صدی کا عرصہ گزر جانے کے بعد اس سمت میں ہونے والی پیش رفت کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی کا مقالہ ہے، جس کا عنوان ہے:

"Islamization of Knowledge: Reflections on Priorities"

(علوم کی اسلامی تدوین۔: ترجیحات کا جائزہ)

یہ مقالہ امریکی جریدے American Journal of Islamic Social Sciences (جلد ۲۸، شمارہ ۳) میں شائع ہوا تھا۔ محترم مقالہ نگار نے علوم کی اسلامی تدوین کے سلسلے میں پیش کیے گئے تصورات اور اس سمت میں کی جانے والی عملی کوششوں کا جائزہ لیا ہے، خصوصاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں اور ڈاکٹر، اسماعیل فاروقی مرحوم کے پیش کردہ خاکہ پر گفتگو کی ہے۔ اس مقالے کے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

(الف) علوم کی اسلامی تدوین پر گفتگو کرتے ہوئے دو طرح کے کاموں میں فرق کیا جانا چاہیے، اگرچہ دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ان میں سے ایک کام موجود علمی سرمائے کا مفید استعمال ہے۔ یہاں اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ معلومات کا استعمال اخلاقی قدروں کے تابع اور اخلاقی حدود کا پابند ہو۔ یہ کام کے کرنے کے لیے اخلاقی

اقدار کا شعور اور انسانی زندگی سے اُن کے ربط کی دریافت وشناخت ضروری ہے۔ اس کام سے جداگانہ مستقل حیثیت رکھنے والا دوسرا کام یہ ہے کہ موجود علمی سرمائے میں اضافہ کیا جائے، نئی معلومات فراہم کی جائیں اور تخلیقی صلاحیت سے کام لے کر علم کے دائرے کو وسیع کیا جائے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے آزاد فضا درکار ہے، جہاں دماغوں اور ذہنوں کو سوچنے اور نئی راہیں تلاش کرنے کی آزادی ہو۔

(ب) مندرجہ بالا دونوں کاموں کی اہمیت مسلّم ہونے کے باوجود ان میں سے موخر الذکر کام زیادہ ترجیح کا مستحق ہے۔ لیکن محسوس ہوتا ہے کہ علوم کی اسلامی تدوین کے مجوزین اور داعیان ابھی تک تخلیقی کام کو وہ اہمیت نہیں دے سکے ہیں، جو اسے ملنی چاہیے تھی۔

(ج) علم کے دائرے کو وسیع کرنے کا کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے آفاقی ہے، یعنی اس کام کی انجام دہی میں انسانیت کے مختلف گروہوں کا باہمی تعاون ممکن بھی ہے اور ضروری بھی۔ دین وعقیدے یا اخلاقی نقطہ نظر کے اختلاف کو اس تعاون میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔

(د) علم کو حصولِ قیادت یا حصولِ اقتدار کا ذریعہ سمجھنا محلِّ نظر ہے۔ علم کا یہ تصور منفی رویّوں کو جنم دیتا ہے۔

(ہ) یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ انسان کی صلاحیت محدود ہے، وہ سب کچھ نہیں جان سکتا اور انسانی علم کا ہر جز یکساں قطعیت کا حامل نہیں ہوسکتا۔ انسانی معلومات کا ایک بڑا حصہ ظنّی ہوتا ہے اور اس میں ابہام پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قطعیت کا دعویٰ کرنے کے بجائے علم کی جستجو کرنے والوں کے لیے انکسار کا رویہ زیادہ مناسب ہے۔

(و) یہ سوال سنجیدہ غور کا مستحق ہے کہ کیا مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ دنیا کی امامت کریں، اس پر غلبہ حاصل کریں اور دنیا کا نقشہ اسلام کے مطابق بدلیں۔ (طریقِ کار کی گفتگو یہاں نہیں ہورہی ہے، بلکہ سوال خود مقصد ومنزل کی تعیین سے متعلق ہے۔ طریقِ کار کے پُرامن ہونے کے بارے میں اطمینان کے باوجود خود مقصد کے بارے میں یہ سوال باقی رہتا ہے)

(ز) ضرورت ایک ایسے علم کی دریافت کی ہے جو وقت کے ساتھ بدلتی ضرورتوں کو پورا کر سکے، جس کا مفید استعمال کیا جائے اور جو روحانی اساس پر استوار اخلاقی نقطۂ نظر کی رہ نمائی سے فیض یاب ہو۔''

پورا مقالہ دل چسپ اور فکر انگیز ہے۔علوم کی اسلامی تدوین کی تحریک موجودہ مرحلے سے کس طرح آگے بڑھے؟ اس سلسلے میں عملی مسائل اور اقدامات پر گفتگو مقالے کے آخری حصے میں کی گئی ہے، خصوصاً سماجی علوم میں پیش رفت کے سیاق میں۔لیکن اس وقت مندرجہ بالا نکات میں سے چند سے ہی تعرض کیا جاسکے گا۔

تخلیقیت

ترجیحات کی ترتیب کے بارے میں محترم مقالہ نگار کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ علمی سرمائے میں اضافے کا کام ترجیحِ اول کی حیثیت رکھتا ہے اور موجودہ معلومات کے مفید استعمال کی اہمیت اس کے بعد ہے۔علوم کی اسلامی تدوین کی تحریک اس ترتیب کو کیوں ملحوظ نہیں رکھ سکی؟ یہ سوال قابلِ غور ہے۔بہ ظاہر اس کی تین وجوہ سمجھ میں آتی ہیں:

ایک وجہ تو یہ ہے کہ علمی سرمائے میں اضافہ کا کام نسبتاً مشکل ہے۔نئی راہیں تلاش کرنا اور نئے زاویوں سے سوچنا آسان نہیں ہوتا۔اس کام کے لیے فضا کی سازگاری کی بھی ضرورت ہے۔عموماً مسلم ممالک کے اندر آزادی کا ماحول نہیں پایا گیا ہے۔اس صورت حال کا اثر مسلمانوں کے علمی اداروں کی فضا پر بھی پڑا ہے۔تخلیقی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی نہ ہونا تخلیقی عمل میں بڑی رکاوٹ ہے۔

دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ علوم کی اسلامی تدوین کے ابتدائی داعیوں اور بعد میں اس کام کی طرف توجہ دلانے والوں کے ذوق ومزاج میں ایک اہم فرق موجود ہے۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسلامی اساس پر علم کے ارتقاء کی جانب دعوت دی۔محترم موصوف کی اس دعوت کا سیاق اسلامی تحریک ہے جو ہدایتِ الٰہی کے مطابق انسانی زندگی کی تعمیرِ نو کی طرف

بلاتی ہے۔اس سیاق میں علوم کی اسلامی تدوین کا کام ایک زندہ عمل بن جاتا ہے، جو انسانی زندگی سے مربوط ہے۔بعد کے مفکرین مثلاً ڈاکٹر اسماعیل فاروقی کی تحریروں میں گفتگو کا طرز اکثر کتابی (اکیڈمک) نوعیت کا ہے، جہاں زندگی سے ربط کو زیرِ بحث تو لایا گیا ہے، مگر محض (مسلمانوں یا انسانوں کے) مسائل کے حوالے سے۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ کے افکار میں علوم کی نئی جہت کی تلاش کی طرف واضح اشارے نظر آتے ہیں، جب کہ فاروقی کے خاکے میں مرکزی مقام موجود علم کے جائزے اور اس کی ترتیبِ نو کو حاصل ہے۔ (خواہ یہ علم مسلمانوں کے ماضی کے علمی سرمائے سے ماخوذ ہو یا حال اور ماضی قریب کے مغربی مفکرین سے حاصل کیا گیا ہو۔) اس فرق کی بنا پر مولانا مودودیؒ کے اندازِ فکر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔اس موضوع پر اُن کی تحریریں مختصر ہونے کے باوجود علوم کی اسلامی تدوین کی تحریک کو ترجیحات کی صحیح ترتیب قائم کرنے میں مدد دے سکتی ہیں۔

موجودہ صورت حال کی ایک تیسری وجہ بھی محسوس ہوتی ہے۔علوم کی اسلامی تدوین کی موجودہ تحریک نے (جو ایک تہائی صدی سے زیادہ عرصے سے موجود ہے) نتائج کے جلد حصول کی طرف توجہ دی، چنانچہ اُن (داعیوں) کی طبیعت اس کام کے اُن تقاضوں کی طرف مائل نہیں ہوئی جو دیر طلب تھے۔فاروقی نے اپنا مشہور بارہ نکاتی خاکہ پیش کیا، جس میں ترتیب کے ساتھ اُن اقدامات کی نشان دہی کی گئی جن کے ذریعے علوم کی تدوین کا کام انجام پا سکتا تھا۔ان اقدامات میں آخری اقدام نصابی کتب کی تیاری کا تھا۔اس پورے اندازِ فکر میں عجلت پسندی جھلکتی ہے۔سوچا یہ گیا کہ ایک مرتبہ نصابی کتب مرتب ہو جائیں تو گویا تدوینِ علوم کا کام مکمل ہو جائے گا اور اس کے بعد محض ان کتابوں کا پڑھنا پڑھانا کافی ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نئے خطوط پر علمی ارتقاء پیشِ نظر ہو تو آدمی کے ذہن میں آغازِ کار کے طور پر نصابی کتب تیار کرنے کا خیال نہیں آئے گا، بلکہ وہ تحقیقی سرگرمیوں پر توجہ کرے گا۔بہ ہر صورت اب ماضی کے تجربات کی مدد لیتے ہوئے ترجیحات کی درستگی ضروری ہے۔ایسی تحقیقی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے جو علمی ارتقاء اور علمی سرمایے میں اضافے کی راہیں کھول سکیں۔علم کا درست اور مفید استعمال اپنی جگہ ضروری ہے، لیکن تحقیقی اسپرٹ سے عبارت تحقیقی سرگرمی زیادہ ضروری ہے۔

آفاقیت

علوم کا مغربی نقطۂ نظر آفاقی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ مغربی دنیا کے جدید دور میں مشاہدے، تجربے اور اُن پر مبنی عقلی استدلال کو درست علمی طریقِ کار قرار دیا گیا اور یہ سمجھا گیا کہ علم و تحقیق کا یہ طریقہ طبیعی علوم اور انسانی علوم دونوں میں یکساں کارآمد اور درست ہے۔ اس طریقِ کار کے ساتھ چند مفروضات کو بھی مغربی علمی دنیا میں اساسی حیثیت دی گئی، اگرچہ عموماً ان مفروضات کو صراحت کے ساتھ بیان نہیں کیا جاتا، مثلاً یہ خیال کہ حقیقت بس اتنی اور ویسی ہی ہے جیسی نظر آتی ہے۔ (بہ الفاظِ دیگر عالمِ غیب کا کوئی وجود نہیں ہے) یا یہ مفروضہ کہ طبیعی دنیا، بعض قوانینِ طبیعی کے تحت خود بخود کام کر رہی ہے۔ اس میں ہونے والے واقعات اور اس میں نظر آنے والے مظاہر کے پیچھے کسی خالق اور رب کی حکمت و ربوبیت کارفرما نہیں ہے۔ ان مفروضات کے علاوہ جہاں تک انسانی سماج میں مطلوب اقدار کا معاملہ ہے، مغربی دنیا نے اپنے ذوق و مزاج اور رجحان کے مطابق (جو تاریخی عوامل کے نتیجے میں تشکیل پایا تھا) انسانی سماج کے لیے بعض رویّوں کو پسندیدہ قرار دیا اور معاشرے میں اُن کو رائج کرنے کی سعی کی۔ مثلاً انفرادی معاملات میں فرد کی مطلق آزادی، عورت اور مرد کے دائرہ کار کی یکسانیت اور معاشی سرگرمیوں میں ریاست کی کم سے کم مداخلت۔ اسی طرح سیاسی زندگی میں عوام کی حاکمیت اور مذہب و ریاست کی علیٰحدگی کو اصول کے طور پر اختیار کیا گیا۔ مغربی دنیا کی عمومی رائے یہ ہے کہ علمی تحقیق کا مغربی طریقِ کار ـــ زندگی اور کائنات کی حقیقت کے بارے میں اس کے مفروضات اور انسانی طرزِ عمل کے سلسلے میں مطلوب و نامطلوب کے مغربی پیمانے ـــ یہ سب آفاقی نوعیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ساری انسانیت کو چاہیے کہ انھیں اختیار کرے۔ ایسا کرنا مغرب کے نزدیک دانش مندی اور روشن خیالی کی علامت اور دورِ جدید کے تقاضوں کا صحیح جواب ہے۔ اس کے برعکس مغربی علمی تصورات اور پیمانوں کو اختیار نہ کرنا تاریک خیالی کی دلیل ہے اور ایسا طرز اختیار کرنے والے زمانے کے تیز رفتار سفر میں پچھڑ جائیں گے اور ترقی نہیں کر سکیں گے۔

آفاقیت کا ہر دعویٰ (صحیح ہو یا غلط) اپنے اندر بڑی کشش رکھتا ہے، اس لیے کہ انسان

کی فطرت آفاقی واقع ہوئی ہے۔ مختلف گوشوں سے یہ بات کہی تو ضرور گئی ہے کہ انسانیت کے مختلف گروہوں اور قوموں کے لیے حق وصداقت کے الگ الگ معیارات ہو سکتے ہیں اور ان سب مختلف معیارات کو یکساں اعتبار سے موزوں و درست قرار دیا جانا چاہیے۔ (اس خیال کو Relativism (اضافیت) کہا جا سکتا ہے) لیکن معیارات کے سیاق میں اضافیت کے اس نقطۂ نظر کی کوئی مضبوط دلیل موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ خیال انسانی وجدان سے بھی ٹکراتا ہے، اس لیے کہ انسانوں کی حس ہمیشہ سے غلط اور صحیح میں امتیاز کے اور ردوقبول کے پیمانوں کو آفاقی سمجھتی آئی ہے اور اب بھی ایسا ہی سمجھتی ہے۔ تاریخ کے دوران مختلف گروہوں کی سرگرمیوں کا جائزہ اور تجربات سے سیکھنے اور سبق حاصل کرنے کا سارا کام جانچ کے پیمانوں کو آفاقی تسلیم کرنے کے بعد ہی انجام پا سکتا ہے۔

آفاقیت کی جانب اس رجحان کی روشنی میں محترم مقالہ نگار کے اس خیال سے اتفاق کیا جانا چاہیے کہ علم کے دائرے میں توسیع کا عمل آفاقی نوعیت رکھتا ہے، چنانچہ اس کام کو امتِ مسلمہ تک محدود سمجھنے یا محدود رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تحقیق اور علمی جستجو کے عمل میں سارے انسانوں کی شرکت ہونی چاہیے۔ لیکن تحقیق اور دریافت کی کاوشوں کی آفاقیت تسلیم کرنے کے ساتھ یہ حقیقت بھی تسلیم کی جانی چاہیے کہ معلومات کی فراہمی، تحقیق و جستجو اور حاصل شدہ معلومات کی ترتیب وتدوین کا سارا کام بہر حال کسی نہ کسی تصورِ کائنات کے تحت ہی انجام پاتا ہے۔ مزید برآں جہاں تک اس دائرۂ علم کا تعلق ہے جس کو انسانی علوم سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہاں علمی سرگرمیوں کو منظم کرنے کے لیے تصورِ کائنات کے علاوہ اخلاقی قدروں کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ چنانچہ اصل سوال یہ ہے کہ وہ آفاقی تصورِ کائنات کیا ہے جس پر تحقیق کرنے والے باہم اتفاق کر سکیں؟ اور وہ اقدار کون سی ہیں، جن کو وہ سب تسلیم کر لیں؟

مندرجہ بالا سوال مسلمانوں کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ جہاں تک تصورِ کائنات کا تعلق ہے (جس میں تصورِ انسان شامل ہے) ہمارے سامنے دو تصورات آتے ہیں: ایک مغرب کا غالب تصور ہے جو پچھلی چار صدیوں کے دوران منظرِ عام پر آیا ہے۔ یہ تصورِ کائنات وانسان، مادیت اور الحاد سے متاثر ہے۔ دوسرا قابلِ توجہ تصور توحید پر مبنی تصورِ کائنات ہے، جس کی

جھلکیاں اقوامِ عالم کے مذہبی لٹریچر میں پھیلی ہوئی ہیں اور جس کا واضح اور مربوط بیان اسلام نے پیش کیا ہے۔ان دو تصورات کے علاوہ کوئی تیسرا قابلِ لحاظ نظریہ موجود نہیں ہے، جو کائنات اور انسان سے متعلق بحث کرتا ہو۔(مشرکانہ تصورات کو ان کے قائلین نے عموماً بعض مراسم تک محدود رکھا ہے اور علمی سرگرمیوں میں وہ مادی تصورِ کائنات کے ہی قائل نظر آتے ہیں)۔مادیت اور الحاد سے متاثر مغربی تصورِ کائنات ہو یا اسلام کا پیش کردہ توحید پر مبنی تصور کائنات، دونوں آفاقیت کے مدعی ہیں اور اپنی صداقت کے دعوے کو انسانیت کے کسی خاص گروہ تک محدود نہیں رکھتے۔(یہ الگ بات ہے کہ بہت سے مسلمان تصورِ توحید کی اس آفاقیت کو فراموش کر بیٹھے ہیں)۔

توحید کی آفاقیت کے ادراک سے ایک اہم نتیجہ نکلتا ہے۔وہ یہ کہ انسانوں کے مختلف گروہ اگر اسلام کو بہ حیثیت دین قبول نہ کریں تب بھی اُن کے لیے یہ ممکن ہے کہ علمی تحقیق اور معلومات کی ترتیب کے لیے توحید کو اساس قرار دیں اور توحید سے ہم آہنگ تصورِ انسان کو اپنائیں۔یہی وہ رویہ ہے جس کی طرف مسلمان انسانوں کو بلا سکتے ہیں۔انسان کے متعلق اسلام بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی اشیاء کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے۔اشیاء سے انسان کے اس تعلق کو قرآنِ مجید، تسخیر سے تعبیر کرتا ہے۔تسخیر کا تقاضا ہے کہ انسان کائنات کی اشیاء کا مفید استعمال کرے اور اس میں کوئی جھجک محسوس نہ کرے۔اس لیے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ سب اشیاء اس کے لیے جائز ہیں۔قرآن مجید کا ارشاد ہے:

يٰبَنِيۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِيۡنَتَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا وَلَا تُسۡرِفُوۡا ‌ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ۝ قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِيۡنَةَ اللّٰهِ الَّتِىۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ‌ ؕ قُلۡ هِىَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا خَالِصَةً يَّوۡمَ الۡقِيٰمَةِ‌ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ۝

(الاعراف ۷:۳۱،۳۲)

''اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور

حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے کہو: کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے اللہ کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو: یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالصۃً انہی کے لیے ہوں گی۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں، اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔''

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ (لقمان:۲۰)

''کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمان کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں......''

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۳ (الجاثیۃ:۱۲، ۱۳)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا، تاکہ اُس کے حکم سے کشتیاں اُس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار رہو۔ اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ سب کچھ اپنے پاس سے، اس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

تسخیر کا مفہوم بیان کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''کسی چیز کو کسی کے لیے مسخر کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ وہ چیز اُس کے تابع کر دی جائے اور اسے اختیار دے دیا جائے کہ جس طرح چاہے اُس میں تصرف

کرے اور جس طرح چاہے اُسے استعمال کرے۔ دوسری یہ کہ اس چیز کو ایسے ضابطے کا پابند کر دیا جائے جس کی بدولت اُس شخص کے لیے نافع ہو جائے اور اس کے مفاد کی خدمت کرتی رہے۔

زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ایک ہی معنی میں مسخر نہیں کر دیا ہے، بلکہ بعض چیزیں پہلے معنی میں مسخر کی ہیں اور بعض دوسرے معنی میں۔ مثلاً ہوا، پانی، مٹی، آگ، نباتات، معدنیات، مویشی وغیرہ بے شمار چیزیں پہلے معنی میں ہمارے لیے مسخر ہیں اور چاند، سورج وغیرہ دوسرے معنی میں۔''

(تفہیم القرآن، سورہ لقمان، حاشیہ ۳۵)

توحید، خلافت، امانت اور تسخیر پر مبنی تصورِ کائنات و انسان ایک ایسا آفاقی نظریہ فراہم کرتا ہے جو علم و تحقیق کی درست اساس ہے۔ مادیت اور الحاد سے متاثر مغربی تصور کائنات کے بجائے، توحید پر مبنی اِس تصور کو تمام انسان اپنا سکتے اور اس بنیاد پر علمی سرگرمیوں کو منظم کر سکتے ہیں۔ اسلام سے باقاعدہ وابستگی، اس کے لیے لازمی شرط نہیں ہے۔ اسلام نے اخلاقی قدروں کے ضمن میں اپنے نقطۂ نظر کو بیان کرنے کے لیے معروف اور مُنکر کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ یہ اصطلاحیں آفاقی مفہوم کی حامل ہیں۔ جو افراد اسلام کو بہ حیثیت دین قبول نہ کریں، اُن کو بھی معروف کی طرف بلانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور اسی طرح اُن کو منکر سے روکنا بھی۔ چنانچہ معروف اور منکر دو متضاد انسانی رویوں کی جانب اشارہ کرنے والے جامع عنوانات ہیں، جن میں پہلا رویہ فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہے اور دوسرا اس فطرت سے انحراف کا غمّاز ہے۔ انسانوں میں عقیدے کے اختلاف کے باوجود اخلاقی اقدار کے سلسلے میں اُن کا متحد الخیال ہونا ممکن ہے اور باہمی تعامل کے لیے ضروری بھی ہے۔ معروف و منکر کے تصورات اس اتحاد کی بنیاد ہیں۔ انسانی معاشرے کو تباہی اور انتشار سے بچانے کے لیے اخلاقی اقدار کی آفاقیت پر زور دینا ضروری ہے۔

'معروف' کے معنیٰ بیان کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''معروف کا لفظ قرآن میں بہ کثرت استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد وہ صحیح طریقِ کار

ہے، جس سے بالعموم انسان واقف ہوتے ہیں، جس کے متعلق ہر وہ شخص، جس کا کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو، یہ بول اٹھے کہ بے شک حق اور انصاف یہی ہے اور یہی مناسب طریقِ عمل ہے۔'' (تفہیم القرآن، سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۷۹)

''دعوتِ حق کی کام یابی کا گر یہ ہے کہ آدمی فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کے بجائے لوگوں کو معروف، یعنی اُن سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کرے، جنھیں بالعموم سارے ہی انسان بھلا جانتے ہیں یا جن کی بھلائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقلِ عام (Common Sense) کافی ہوتی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔''

(ایضاً، سورہ اعراف، حاشیہ ۱۵۰)

'معروف' کا برعکس مفہوم رکھنے والی اصطلاح 'منکر' ہے۔ منکر کا مفہوم یہ ہے:

''منکر سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور تمام شرائع الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔'' (ایضاً، سورہ نحل، حاشیہ ۸۹)

مسلمان تخلیقی صلاحیت سے کام لے کر توحید کی اساس پر علمی و تحقیقی سرگرمیوں کو منظم کریں تو علم کے دائرے کو وسیع کرنے میں تمام خدا پرستوں کا تعاون اُن کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اساس کی طرح اخلاقی قدریں بھی انسانیت کے درمیان مشترک ہیں، چنانچہ مطلوب انسانی رویہ وہ ہے جو معروف کی تعریف پر پورا اترتا ہے۔ اسی طرح منکر ایسا رویہ ہے جو ناپسندیدہ اور نامطلوب ہے۔ اس طرح وہ آفاقی بنیاد فراہم ہو جاتی ہے جو مغرب کے مادّی نقطۂ نظر کا متبادل بن سکتی ہے۔

امامت، قیادت اور اقتدار

امتِ مسلمہ کے سپرد کیا کام کیا گیا ہے؟ اس سلسلے میں عموماً اس آیت سے رہ نمائی حاصل کی جاتی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ

الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں (کی ہدایت و اصلاح) کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔تم معروف کا حکم دیتے ہو،منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہلِ کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایمان لانے والے بھی پائے جاتے ہیں،مگران کے بیش تر افراد نافرمان ہیں۔''

اس آیت کی رو سے امتِ مسلمہ اس امر کی پابند ہے کہ انسانوں سے ربط رکھے، اُن کو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔آیت کے الفاظ عام ہیں، چنانچہ امتِ مسلمہ کو یہ کام ہر حال میں کرنا ہوگا، خواہ اسے حکومت اور اقتدار حاصل ہو یا نہ حاصل ہو۔ البتہ قرآنِ مجید صراحت کے ساتھ اس صورت حال کے بارے میں گفتگو، دوسرے مقام پر کرتا ہے، جب اہلِ ایمان کو اقتدار حاصل ہو:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾ (الحج: ۴۱)

''یہ (اہلِ ایمان) وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے،معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

دونوں آیات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر امتِ مسلمہ کا دائمی وظیفہ ہے، اقتدار حاصل ہونے کے بعد بھی اور اُس سے پہلے بھی۔ امت کی یہ دائمی صفت انسانیتِ عامہ سے اُس کے دائمی ایجابی ربط کی اہمیت واضح کرتی ہے۔ معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کے کام کو انسانوں کی 'رہ نمائی' کرنے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انسان اس رہ نمائی کو قبول کرتے ہیں یا بے اعتنائی برتتے ہیں، ہر صورت میں اس رہ نمائی کا فراہم کرنا

امت کی ذمہ داری ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ امت کا منصب انسانیت کے رہ نما گروہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے انسانوں کا رہ نما بنایا ہے اور اس کو انسانیت کی امامت کا کام سپرد کیا ہے۔ اس اصولی صورت حال کی توضیح کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ عملی صورتِ حال کیا ہوسکتی ہے:

(الف) ایک اِمکان یہ ہے کہ خود امت یا اس کے بیش تر افراد یہ بات بھول جائیں کہ انھیں انسانیت کی رہ نمائی کرنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں امت انسانوں سے بے تعلق رہے گی اور دنیا میں کوئی تعمیری کردار ادا نہ کرسکے گی۔

(ب) دوسرا امکان یہ ہے کہ امت کو اپنا مقام و منصب یاد ہو، وہ انسانوں کو رہ نمائی فراہم کرے، لیکن اس کے مخاطبین بے اعتنائی برتیں اور اس کی رہ نمائی سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ اس صورت میں کم از کم فوری طور پر انسانوں کے عام رویے کو امت متاثر نہ کرسکے گی۔ البتہ یہ توقع ضرور کی جاسکتی ہے کہ خود امت راہِ راست پر قائم رہے گی۔

(ج) تیسری ممکن صورت یہ ہے کہ انسانیت امت کی فراہم کردہ رہ نمائی کی قدر کرے اور اس کو قبول کرے۔ اس صورت میں یہ کہا جاسکے گا کہ امت کو قیادت حاصل ہوگئی ہے، یعنی لوگ امت کی رہ نمائی سے فائدہ اٹھانے لگے ہیں۔

مندرجہ بالا تینوں امکانات کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں کی رہ نمائی امت کا لازمی کام ہے۔ قیادت کے حصول کو بہ ذاتِ خود امت کا مقصد قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امت کی فراہم کردہ رہ نمائی کو انسان قبول کرلیں تو امت کو قائدانہ پوزیشن حاصل ہوجائے گی۔ اگلا سوال اقتدار اور حکومت سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں قرآنِ مجید بتاتا ہے کہ ایمان اور عملِ صالح سے متصف ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو اقتدار عطا کرے گا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا

يُشْرِكُوْنَ بِیْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۵۵ (النور:۵۵)

''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ اُن کو زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اُن کے لیے اُن کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے اور اُن کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔''

آیتِ بالا کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کی موجودہ حالتِ خوف کو حالتِ امن سے بدل دے گا۔'' اس ارشاد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو اقتدار اہلِ ایمان کو حاصل ہو اس کی غرض یہ ہوگی کہ وہ اہلِ کفر کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور بے خوف وخطر اللہ کی بندگی کریں۔ اقتدار اس لیے نہ ہوگا کہ مسلمان، دوسرے انسانوں پر اپنی آقائی جمائیں۔ کفر اور اہلِ کفر کے تسلط سے مسلمانوں کی آزادی یقیناً مطلوب ہے۔ یہ پہلو سامنے رکھا جائے تو اسلام کے غلبے کے لیے شعوری کوشش کے سلسلے میں کوئی تردّد باقی نہیں رہتا۔

علوم کی اسلامی خطوط پر تدوین (Islamization of Knowledge) کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے آخر میں یہ گزارش ضروری ہے کہ یہ اصطلاح پیشِ نظر کام کے لیے موزوں اصطلاح نہیں ہے۔ اسلامائزیشن کے لفظ سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ علم اور معلومات تو موجود ہیں، جو کچھ کرنا ہے وہ محض یہ ہے کہ معلومات کے اس ذخیرے کو اسلام کے قالب میں ڈھالا جائے۔ صورت حال کی یہ تصویر ناقص بھی ہے اور مغالطہ آمیز بھی۔ جیسا کہ محترم مقالہ نگار نے نشان دہی کی ہے، اصل سوال تحقیق کا اور نئی معلومات کی دریافت کا ہے۔ اس تحقیق و کاوش کی اساس اور طریقِ کار ایسا ہونا چاہیے جو اسلامی مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ شعور خود اعتمادی اور جرأت کے ساتھ امت کے اہلِ دانش اس علمی و تحقیقی سفر کا آغاز کریں تو انسانیت کے خیر پسند عناصر کو اپنا ہم سفر بآسانی بنا سکیں گے۔

اِنسانی سماج اور اشتراکِ عمل

اِنسانوں کا ایک دوسرے سے مِل کر رہنے کا جذبہ اِنسانی تمدن کی بنیاد ہے۔ اِس جذبے کو اِنسانی فطرت کا ایک بنیادی جُز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِنسانوں کے اجتماعی ادارے اِسی جذبے کا مظہر ہیں۔ ہر اجتماعی ادارے میں مختلف افراد کسی متعین سماجی ضرورت کی تکمیل کے لیے اشتراکِ عمل کرتے ہیں۔ اِس کے لیے ناگزیر ہے کہ اجتماعی ادارے سے وابستہ افراد کے افکار وخیالات میں کم از کم اس حد تک یکسانیت موجود ہو جو ادارے کے چلانے کے لیے ضروری ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اِنسانوں کے درمیان بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ رنگ اور نسل کا اختلاف بھی ہوتا ہے اور زبان اور علاقے کا بھی۔ طبیعتوں اور مزاج کا اختلاف بھی ہوتا ہے اور ذوق ورجحان کا بھی۔ اِسی طرح صلاحیتوں میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ کچھ لوگ جسمانی محنت کر سکتے ہیں تو کچھ ذہنی ریاضت میں آگے ہوتے ہیں۔ کچھ میں قیادت کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ ہزاروں افراد سے کام لے سکتے ہیں تو کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو گنتی کے افراد کی قیادت بھی نہیں کر سکتے۔ ان تمام اختلافات کے باوجود اِنسانوں کے درمیان اشتراکِ عمل ممکن ہے۔ تاریخ اِنسانی میں بارہا مختلف نسلوں اور علاقوں کے لوگوں نے مشترک مقاصد کے لیے کام کیا ہے اور آج کی دنیا میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ رہا صلاحیتوں کا اختلاف تو وہ نہ صِرف اشتراکِ عمل میں رکاوٹ نہیں بنتا، بلکہ اشتراک کے لیے راہیں کھولتا ہے۔ البتہ خیالات وافکار کا اختلاف ایسا اختلاف ہے جو اگر ایک حد سے آگے بڑھ جائے تو اِنسانوں کے درمیان اشتراکِ عمل ممکن نہیں رہتا۔ اب چوں کہ مِل جُل کر کام کرنا اِنسانوں کی ضرورت بھی ہے اور اُن کی فطرت کا تقاضا بھی، اِس لیے اختلافِ افکار کو معقول حد تک محدود کرنے کی راہ تلاش کرنا ضروری

ہے۔ اختلافِ افکار کے مسئلے کو حل کرنے کی سعی سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ خود افکار کے اختلاف کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے۔

اختلافِ افکار اور اختلافِ دین

یہ واقعہ ہے کہ اِنسانی ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ ہے۔ اِنسان کے دِل میں خیالات آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ جو لوگ کوئی مستحکم فکر نہیں رکھتے وہ اپنے ان متفرق خیالات کے پیرو ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُن کا عملی رویّہ بھی غیر مستحکم اور ڈانوا ڈول (متزلزل) ہوتا ہے۔ کبھی خیالات کی ایک لہر انھیں نیکی کی طرف لے جاتی ہے تو کبھی اُس کے خلاف لہر انھیں بدی پر آمادہ کر دیتی ہے۔ عموماً اُن کی ذہنی کیفیات خارجی حالات کی تابع ہوتی ہیں۔ چنانچہ حالات کی تنگی یا کشادگی اُن کے رویّے کو بدل دیتی ہے۔ قرآن مجید میں ایسے لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے:

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ○ (لقمان:۳۲)

”اور جب (سمندر میں) ان لوگوں پر ایک موج سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں اپنے دین کو بالکل اسی کے لیے خالص کر کے۔ پھر جب وہ بچا کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو اُن میں سے کوئی اقتصاد برتتا ہے اور ہماری نشانیوں کا اِنکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو غدار اور ناشکرا ہے۔“

اِس کے برعکس محکم فکر کی بنیاد ایمان پر ہوتی ہے۔ جو شخص اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاتا ہے وہ خیالات کے انتشار سے بچ جاتا ہے۔ اُس کو وہ بصیرت حاصل ہو جاتی ہے جو اس کے خیالات میں درستگی، ترتیب اور نظم پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ ہر حال میں حق پر قائم رہنا اُس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ایمان کے اِن ثمرات کو بیان کیا گیا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ

لَآ انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (البقرۃ:۲۵۶،۲۵۷)

''دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ (جس کا سہارا اُس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اُن کا حامی و مددگار اللہ ہے، وہ اُن کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، اُن کے حامی و مددگار طاغوت ہیں۔ وہ انھیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اللہ پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اللہ کے دین کو اختیار کرے اور اُس کی پیروی کرے۔ اِسی طرح اِس کے برعکس بات بھی درست ہے۔ جو شخص اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان نہیں لاتا بلکہ اُن کا اِنکار کرتا ہے (یعنی کفر کرتا ہے) وہ لازماً اللہ کے دین کے بجائے کسی اور دین کا پیرو سمجھا جائے گا۔ قرآن مجید نے اِس حقیقت کو صاف صاف بیان کر دیا ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ○ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ○ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ○ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ○ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ○ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ○ (الکافرون)

''کہہ دو کہ اے کافرو! میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو۔ نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔''

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں چند امور سامنے آتے ہیں:

(الف) اِنسان کس دین کا پیرو ہے، اِس کا انحصار اِس پر ہے کہ وہ عبادت کس کی کرتا ہے؟ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی لاشریک عبادت کرتا ہے تو وہ اللہ کے دین یعنی دینِ حق کا پیرو سمجھا جائے گا اور اگر وہ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کی عبادت کرتا ہے یا عبادت میں اللہ کے ساتھ اُن کو بھی شریک کرتا ہے تو وہ اللہ کے دین کا پیرو نہ ہوگا، بلکہ کسی باطل دین کا پیرو قرار دیا جائے گا۔

(ب) دین، خواہ حق ہو یا باطل، اگر اِنسان اُس کی پیروی اختیار کرے تو اُس کے افکار و خیالات اُس دین کے پیش کردہ تصورِ کائنات کے عکاس ہوں گے اور اُس کا عملی رویہ بھی اُن افکار کے تابع اور اُن کے مطابق ہوگا۔

(ج) چنانچہ اختلافِ افکار کا اصل منبع اختلافِ دین ہے۔ بہ الفاظ دیگر اِنسانوں کے خیالات وافکار کے مختلف ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ اُن کے دین مختلف ہیں۔

دین سے رسمی وابستگی

اِس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بسا اوقات دین ایک ہونے کے باوجود اِنسانوں کے افکار واعمال میں اساسی اختلافات نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ قرآن مجید اِس سوال کے جواب میں بتاتا ہے کہ اِس صورت حال کی وجہ دین سے حقیقی اور مخلصانہ وابستگی کے بجائے محض رسمی اور بے روح وابستگی ہے، جس کی بنا پر آدمی دینِ حق کی مخلصانہ پیروی کے بجائے خواہشات کی پیروی کرتا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَأُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

(آلِ عمران: ۱۰۵)

”(اے ایمان لانے والو!) کہیں تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھُلی کھُلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے۔ جنھوں نے یہ روش اختیار کی، اُن کے لیے سخت سزا ہے۔“

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ آیتِ بالا کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یعنی یہود و نصاریٰ کی طرح مت بنو جو خدا تعالیٰ کے صاف احکام پہنچنے کے بعد محض اوہام واہواء کی پیروی کر کے اصولِ شرع میں متفرق اور فروع میں مختلف ہو گئے۔ آخر فرقہ بندیوں نے اُن کے مذہب وقومیت کو تباہ کر ڈالا اور سب کے سب عذابِ الٰہی کے نیچے آ گئے۔ اس آیت سے ان اختلافات اور فرقہ بندیوں کا مذموم ومہلک ہونا معلوم ہوا جو شریعت کے صاف احکام پر مطلع ہونے کے بعد پیدا کی جائیں۔''

کہا جا سکتا ہے کہ آیتِ بالا میں (وجہِ اختلاف کے طور پر) خواہشات کی پیروی کا صراحتاً تذکرہ نہیں ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید دوسرے مقامات پر صراحت کے ساتھ اس مظہر کا تذکرہ کرتا ہے جو کتابِ الٰہی کے حامل گروہوں میں ابتدائی دور کے بعد نمودار ہو جایا کرتا ہے۔ ابتدا میں جب انبیاء کی براہِ راست تربیت کے اثرات موجود ہوتے ہیں تو لوگ ہدایت پر قائم رہتے ہیں، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، خواہشات کی پیروی کا فتنہ سَر اُٹھانے لگتا ہے:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۝

(مریم: ۵۹۔ ۶۰)

''پھر اُن کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی۔ پس قریب ہے کہ وہ گم راہی کے انجام سے دوچار ہوں۔ البتہ جو توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں اور نیک عملی اختیار کر لیں وہ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہو گی۔''

بہ ظاہر دین میں متفق ہونے کے باوجود اختلافات کا شکار ہو جانے کی ایک وجہ خواہشات واوہام کی پیروی ہے۔ ان اختلافات کی دوسری وجہ یہ ہے کہ دین کی مکمل اتباع کے بجائے محض بعض اجزاءِ دین پر عمل کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا

تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ۝ وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمۡ فَاتَّقُوۡنِ ۝ فَتَقَطَّعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ بَيۡنَهُمۡ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزۡبٍۢ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ ۝ (المومنون:۵۱-۵۳)

''اے پیغمبرو! کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح، تم جو کچھ بھی کرتے ہو میں اُس کو خوب جانتا ہوں۔ اور یہ تمھاری اُمت ایک ہی اُمت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، پس مجھی سے ڈرو۔ مگر بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کرلیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اُسی میں وہ مگن ہے۔''

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ۝ ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ؕ وَ اِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ ؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ (البقرہ:۸۴-۸۵)

''(اے بنی اسرائیل) ذرا یاد کرو کہ ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو۔ مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو، اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کردیتے ہو، ظلم و زیادتی کے ساتھ اُن کے خلاف جتھے بندیاں کرتے ہو اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے تمھارے پاس آتے ہیں تو اُن کی رِہائی کے لیے فدیے کا لین دین کرتے ہو، حالاں کہ انھیں اُن کے گھروں سے نکالنا ہی سرے سے تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصّے پر ایمان لاتے ہو اور

دوسرے حصّے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، اُن کی سزا اِس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟ اللہ اُن حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔"

واقعہ یہ ہے کہ دینِ حق کی مخلصانہ اور کامل پیروی کا لازمی نتیجہ حاملینِ دین کا باہم اتحاد ہے۔اب اگر حاملینِ دین منتشر نظر آئیں تو اس کی وجہ دین کے بجائے خواہشات کی پیروی ہوگی، یا محض بعض اجزائے دین پر عمل ہو رہا ہوگا اور دین کے کامل اتباع سے غفلت برتی جا رہی ہوگی۔

فروعی اختلافات

دینِ حق کی اساس پر متفق ہونے کے باوجود یہ ممکن ہے کہ اہلِ ایمان کے درمیان فروعی اختلافات پائے جائیں۔ایسے اختلافات اتحادِ امت میں مانع نہیں ہیں۔سورۂ آل عمران آیت ۱۰۵ کی تشریح کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

"اللہ ورسول کے وعدے کے موافق ایک عظیم الشان جماعت بہ حمد اللہ، خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ما انا علیہ واصحابی (میرے اور میرے اصحاب) کے مَسلک پر قائم ہے اور تا قیامت قائم رہے گی۔ باقی فروعی اختلافات صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین میں ہوئے ہیں (وہ اس آیت کے منافی نہیں۔)"

اگر فروعی نوعیت کے اختلافات اہلِ ایمان کے درمیان واقع ہوجائیں تو اُن کے رفع کرنے کا طریقہ قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں اختلافات کو حل کرلیا جائے:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ ذٰ لِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا ۝ (النساء:۵۹)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اِطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں

نزاع ہوجائے تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔''

آیتِ بالا کی تشریح کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یا (اِسلامی) حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلے میں بھی نزاع واقع ہوگی اُس میں فیصلے کے لیے قرآن اور سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اُس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔''

(ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ آیتِ مذکور کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''اگر تم میں اور اولوالامر میں اختلاف ہوجائے کہ حاکم کا یہ حکم اللہ اور رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف تو اُس کو کتاب اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کر کے طے کرلیا کرو کہ وہ حکم فی الحقیقت اللہ اور رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف اور جو بات محقق ہوجائے اُسی کو بالاتفاق مسلّم اور معمول بہ سمجھنا چاہیے اور اختلاف کو دور کردینا چاہیے۔ اپنے تنازعات اور اختلافات کو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنا اور اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرنی مفید ہے۔ آپس میں جھگڑنے یا اپنی رائے کے موافق فیصلہ کرنے سے اِس رجوع کا انجام بہتر ہے۔''

اساسی اور فروعی اختلاف کا امتیازی فرق

حاملینِ دین کے درمیان، کس اختلاف کو اساسی قرار دیا جائے گا اور کس کو فروعی؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اِس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''قرآن اُس صحت بخش اختلافِ رائے کا مخالف نہیں ہے جو دین میں متفق اور اسلامی نظامِ جماعت میں متحد رہتے ہوئے محض احکام و قوانین کی تعبیر میں مخلصانہ تحقیق کی بنیاد پر کیا جائے، بلکہ وہ مذمت اُس اختلاف کی کرتا ہے جو نفسانیت اور کج نگاہی سے شروع ہو اور فرقہ بندی و نزاعِ باہمی تک نوبت پہنچا دے۔'' (مقدمہ تفہیم القرآن)

یہ واقعہ ہے کہ اہلِ عقل و دانش کے مابین فروعی امور میں اختلافات کوئی غیر متوقع شے نہیں ہیں۔ اِس سلسلے میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

''پہلی قسم کا (یعنی فروعی) اختلاف تو ترقی کی جان اور زندگی کی روح ہے۔ وہ ہر اُس سوسائٹی میں پایا جائے گا جو عقل وفکر رکھنے والوں پر مشتمل ہو۔ (ایضاً)

پھر اساسی نوعیت کے اختلافات کے مضر اثرات کا ذِکر کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:

''رہا دوسری قسم کا (یعنی اَساسی) اختلاف تو ایک دنیا جانتی ہے کہ اُس نے جس گروہ میں بھی سَر اُٹھایا اُس کو پراگندہ کر کے چھوڑا۔ اُس کا رُونما ہونا صحت کی نہیں، بلکہ مرض کی علامت ہے اور اُس کے نتائج کبھی بھی اُمت کے حق میں مفید نہیں ہوسکتے۔'' (ایضاً)

دونوں قسم کے اختلافات کی ماہیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا مودودیؒ کہتے ہیں:

''ایک صورت تو وہ ہے جس میں خدا اور رسول کی اطاعت پر جماعت کے سب لوگ متفق ہوں، احکام کا ماخذ بھی بالاتفاق قرآن اور سنت کو مانا جائے اور پھر دو عالم کسی جُزوی مسئلے کی تحقیق میں یا دو قاضی کسی مقدمے کے فیصلے میں ایک دوسرے سے اختلاف کریں۔ مگر اُن میں سے کوئی بھی نہ تو اس مسئلے کو اور اس میں اپنی رائے کو مدارِ دین بنائے اور نہ اُس سے اختلاف کرنے والے کو دین سے خارج قرار دے، بلکہ دونوں اپنے اپنے دلائل دے کر اپنی حد تک تحقیق کا حق ادا کر دیں اور یہ بات رائے عام پر یا اگر عدالتی مسئلہ ہو تو مُلک کی آخری عدالت پر، یا اگر اجتماعی معاملہ ہو تو نظامِ جماعت پر چھوڑ دیں کہ وہ دونوں رایوں میں سے جس کو چاہیں قبول کریں، یا دونوں کو جائز رکھیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اختلاف سرے سے دین کی بنیادوں ہی میں کر ڈالا جائے، یا یہ کہ کوئی عالم یا صوفی یا مفتی یا متکلم یا لیڈر، کسی ایک مسئلے میں جس کو خدا اور رسول نے دین کا بنیادی مسئلہ قرار نہیں دیا تھا، ایک رائے اختیار کرے اور خواہ مخواہ کھینچ تان کر اُس کو دین کا بنیادی مسئلہ بنا ڈالے، اور پھر جو اُس سے اختلاف کرے اُس کو خارج از دین وملت قرار دے اور اپنے حامیوں کا ایک جتھا بنا کر کہے کہ اصل امتِ مسلمہ بس یہ ہے اور باقی سب جہنمی ہیں اور ہانک پکار کر کہے کہ مُسلم ہے تو بس اِس جتھے میں آ جا ورنہ تو مسلم ہی نہیں ہے۔'' (ایضاً)

اِن دو قسم کے اختلافات کے سلسلے میں نبی کریمؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوے کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

"قرآن نے جہاں کہیں بھی اختلاف اور فرقہ بندی کی مخالفت کی ہے اُس سے اُس کی مراد یہ دوسری قسم کا اختلاف ہی ہے۔ رہا پہلی قسم کا اختلاف تو اس کی متعدد مثالیں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آ چکی تھیں اور آپ نے صرف یہی نہیں کہ اس کو جائز رکھا، بلکہ اس کی تحسین بھی فرمائی۔ اِس لیے کہ وہ اختلاف تو اِس بات کا پتہ دیتا ہے کہ جماعت میں غور و فکر اور تحقیق و تجسس اور فہم و تفقہ کی صلاحیتیں موجود ہیں اور جماعت کے ذہین لوگوں کو اپنے دین سے اور اُس کے احکام سے دلچسپی ہے اور اُن کی ذہانتیں اپنے مسائل زندگی کا حل دین کے باہر نہیں، بلکہ اس کے اندر ہی تلاش کرتی ہیں اور جماعت بہ حیثیت مجموعی اِس زرّیں قاعدے پر عامل ہے کہ اصول میں متفق رہ کر اپنی وحدت بھی برقرار رکھے اور پھر اپنے اہلِ علم و فکر کو صحیح حدود کے اندر تحقیق و اجتہاد کی آزادی دے کر ترقی کے مواقع بھی باقی رکھے۔" (ایضاً)

حاملینِ دین کی دینی بصیرت سے یہ توقع کی جانی چاہیے کہ وہ اساسی اور فروعی اختلافات میں امتیاز کریں گے، پھر اس امتیاز کی بنا پر اساسی اختلافات سے بچیں گے اور امت کو بچائیں گے، نیز فروعی اختلافات کے حل کے لیے قرآن و سنت کی طرف رجوع کریں گے جِس کی جانب اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء کی آیت ۵۹ میں رہ نمائی فرمائی ہے۔

ہدایتِ الٰہی کی ضرورت

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:

(الف) اشتراکِ عمل اِنسانی سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اِنسان اپنی فطرت کے عین تقاضے کے مطابق دوسرے اِنسانوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنا چاہتا ہے۔

(ب) اشتراکِ عمل کے لیے ناگزیر ہے کہ حیات و کائنات سے متعلق اساسی امور میں اِنسانوں کے درمیان اتفاق ہو۔

(ج) افکار و خیالات کا یہ اتفاق اُسی وقت ظہور میں آ سکتا ہے جب اِنسان دین کے سلسلے میں

متفق ہوں، اِس لیے کہ دین میں اختلاف کا لازمی نتیجہ، افکار اور طرزِ عمل میں اختلاف ہے۔

اَب سوال یہ ہے کہ وہ دین کون سا ہے، جس پر انسان متفق ہو جائیں؟ خدا کے قائلین کے لیے اِس سوال کا جواب اِس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ دین خالقِ کائنات کا عطا کردہ دین ہے۔قرآن مجید اسی بنیادی حقیقت کی طرف اِنسانوں کو متوجہ کرتا ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ○ (الشوریٰ:۱۰)

’’تمھارے درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو، اُس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔وہی اللہ میرا رب ہے اُسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اُسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔‘‘

اِس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

’’قرآنِ مجید کے الفاظ عام ہیں اور وہ صاف صاف علی الاطلاق تمام نزاعات و اختلافات میں اللہ کو فیصلہ کرنے کا اصل حق دار قرار دے رہے ہیں۔اُن کی رُو سے اللہ جس طرح آخرت کا مالک یوم الدین ہے، اسی طرح اِس دنیا کا بھی احکم الحاکمین ہے۔جس طرح وہ اعتقادی اختلافات میں یہ طے کرنے والا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ ٹھیک اُسی طرح قانونی حیثیت سے بھی وہی یہ طے کرنے والا ہے کہ اِنسان کے لیے پاک کیا ہے اور ناپاک کیا؟ جائز اور حلال کیا ہے اور حرام و مکروہ کیا؟ اخلاق میں بدی و زشتی کیا ہے اور نیکی و خوبی کیا؟ معاملات میں کِس کا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے؟ معاشرت اور تمدّن اور سیاست اور معیشت میں کون سے طریقے درست ہیں اور کون سے غلط؟‘‘ (تفہیم القرآنِ۔سورہ شوریٰ، حاشیہ ۱۴)

یہی بات مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے آیتِ بالا کے ذیل میں فرمائی ہے:

’’یعنی سَب جھگڑوں کے فیصلے اُسی (اللہ) کے سپرد ہونے چاہییں۔عقائد ہوں یا احکام، عبادات ہوں یا معاملات، جس چیز میں بھی اختلاف پڑ جائے اُس کا بہترین فیصلہ اللہ کے حوالے ہے۔وہ دلائل کونیہ کے ذریعے سے یا اپنی کتاب میں یا اپنے

رسولوں کی زبان پر، صراحتہً یا اشارۃً، جس مسئلے کا جو فیصلہ فرمادے، بندے کو حق نہیں کہ اُس میں چوں وچرا کرے۔"

جولوگ چاہتے ہیں کہ اِنسانی سماج میں اشتراکِ عمل کی راہیں ہموار ہوں اُن کو قرآن مجید کی اس قیمتی رہ نمائی کی قدر کرنی چاہیے۔ اِنسانوں کے درمیان اختلافات کے فیصلے کا آخری حق خود اِنسانوں کو یا اُن میں سے کچھ کو نہیں دیا جاسکتا۔ اِس لیے کہ اِنسانوں کی عقل محدود بھی ہے اور خطا کار بھی۔ اختلافات کا وہی فیصلہ قابلِ قبول ہے جو خالقِ کائنات کی جانب سے صادر ہو، اِس لیے کہ اُس کا علم کامل ہے اور وہ حکیم بھی ہے اور بصیر بھی۔

اِنسان کی آزادیِ انتخاب

اِنسانی اختلافات کا حکیمانہ حَل ہدایتِ الٰہی میں موجود ہونے کے باوجود، یہ واقعہ ہے کہ بہت سے انسان ایسے بھی ہوں گے جو ہدایتِ الٰہی کی ناقدری کریں گے۔ چوں کہ دنیا کی اِس زندگی میں آزادیِ عمل سَب کو حاصل ہے، اِس لیے اللہ تعالیٰ زبردستی سے کام نہیں لے گا اور اُن کو ہدایت کے راستے پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کرے گا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے اِس پہلو کا تذکرہ کیا گیا ہے:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○

(الشوریٰ:۸)

"اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی اُمت بنادیتا، مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا نہ کوئی وَلی ہے نہ مددگار۔"

آیتِ بالا کی تشریح کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

"یعنی بے شک اُس (اللہ) کو قدرت تھی۔ اگر چاہتا تو سب کو ایک طرح کا بنادیتا اور ایک ہی راستے پر ڈال دیتا، لیکن اُس کی حکمت اسی کی مقتضی ہوئی کہ اپنی رحمت و غضب دونوں قسم کی صفات کا اظہار فرمائے۔ اس لیے بندوں کے احوال میں

اختلاف وتفاوت رکھا۔ کسی کو اُس کی فرماں برداری کی وجہ سے اپنی رحمت کا مورد بنایا اور کسی کو اُس کے ظلم وعصیان کی بنا پر رحمت سے دور پھینک دیا۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اِس ذیل میں لکھتے ہیں:

''اللہ کی مرضی یہی ہے کہ اِنسانوں کو اختیار وانتخاب کی آزادی عطا کی جائے، پھر جو ہدایت چاہے اُسے ہدایت ملے اور جو گم راہ ہی ہونا پسند کرے اُسے جانے دیا جائے جدھر وہ جانا چاہتا ہے۔ اگر یہ اللہ کی مصلحت نہ ہوتی تو انبیاء اور کتابیں بھیجنے کی حاجت ہی کیا تھی۔ اس کے لیے تو اللہ جل شانہ کا ایک تخلیقی اشارہ کافی تھا۔ سارے انسان اُسی طرح مطیعِ فرمان ہوتے جس طرح دریا، پہاڑ، درخت، مٹی، پتھر اور سب حیوانات ہیں۔'' (تفہیم القرآن، سورۂ شوریٰ، حاشیہ ۱۱)

اِنسانوں کو حاصل حق اور باطل کے درمیان انتخاب کی یہ آزادی اِنسانی سماج کو انتشار کے خطرے سے دوچار کردیتی ہے۔ اس خطرے کے سدّ باب کے لیے اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کی یہ ذمّہ داری قرار دی ہے کہ وہ اِنسانی معاشرے میں معروف کے فروغ اور مُنکر کے استیصال کی ہر ممکن کوشش کرے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (آلِ عمران:۱۱۰)

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے اِنسانوں کی ہدایت واِصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہلِ کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایمان دار بھی پائے جاتے ہیں، مگر ان کے بیش تر افراد نافرمان ہیں۔''

اِنسانی سماج میں اشتراکِ عمل

اللہ کی مشیت کے مطابق افراد کو اپنی شخصی حیثیت میں یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ ہدایت الٰہی پر ایمان لائیں یا نہ لائیں۔ اِنسانوں کی اِس آزادی کو سلب کیے بغیر اُمتِ مسلمہ کی یہ

منصبی ذمہ داری ہے کہ وہ اِنسانی سماج میں معروف کو قائم کرے اور مُنکر کو مٹائے۔اگر یہ کام پوری توجہ اور اہتمام سے انجام پانے لگے تو اِنسانی سماج کا انتشار دور ہوسکتا ہے اور اشتراک عمل کی راہیں ہموار ہوسکتی ہیں۔اہلِ ایمان کی سعی کے نتیجے میں یہ مظہر نمودار ہوگا، خواہ سماج کے سارے افراد نے شخصی وانفرادی حیثیت میں دینِ حق کو قبول نہ کیا ہو۔

معروف اور منکر کی اصطلاحات کا مفہوم بیان کرتے ہوئے مولانا سید جلال الدین عمری لکھتے ہیں:

''اِنسان قانون کا محتاج ہے اور قانون دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔اِنسان نہ تو شخصی زندگی میں قانون سے بے نیاز ہوسکتا ہے اور نہ جماعتی زندگی میں۔لیکن یہ بات اُس کے لیے جائز نہیں ہے کہ خود سے کوئی قانون بنالے اور اُس پر عمل شروع کردے۔خدا کا بنایا ہوا قانون 'معروف' ہے اور جو قانون خدا کے قانون سے ٹکرائے وہ 'منکر' ہے۔'' (معروف ومنکر، باب پنجم)

اِس مفہوم کی روشنی میں اہلِ ایمان کی ذمّہ داری بیان کرتے ہوئے محترم مصنف فرماتے ہیں:

''خدا کا قانون غالب وسربلند ہونے کے لیے آیا ہے۔جو لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں، اُن کا فرض ہے کہ اسے غالب کرنے اور اُس کے مخالف قوانین کو مٹانے کی کوشش کریں۔'' (ایضاً)

واقعہ یہ ہے کہ اگر اُمت مسلمہ اپنے فرضِ منصبی کو تندہی کے ساتھ انجام دینے لگے تو اس کی صفوں میں بھی اتحاد واتفاق پیدا ہوگا اور وسیع تر اِنسانی سماج میں بھی اشتراکِ عمل کی راہ ہموار ہوگی۔کام یابی کے ساتھ اس فریضے کو انجام دینے کے لیے ضروری ہوگا کہ قوی اور مستحکم استدلال کے ذریعے اِنسانی سماج کی مؤثر تربیت کی جائے۔اِس تربیت کے نتیجے میں لوگ معروف کو معروف کی حیثیت سے پہچاننے لگیں گے اور مُنکر کے فی الواقع مُنکر ہونے کے قائل ہوجائیں گے۔توقع کی جانی چاہیے کہ قدروں اور معیارات کی یہ تبدیلی اِنسانی سماج کو اتحاد عمل سے ہم کنار کرے گی۔

سماجی وسیاسی اصلاح کی دینی اساس

ہمارے ملک کا معاشرہ متعدد اخلاقی کم زوریوں کا شکار ہے۔ خیانت و بددیانتی، اباحیت پسندی اور بے راہ روی، اوہام پرستی وتنگ نظری، حرص و ہوس اور مادہ پرستی جیسے سنگین امراض کے علاوہ کم زور افراد و طبقات پر ظلم وستم اور اُن کا استحصال آج کے سماج کی عام روش ہے۔ سماج سے ہٹ کر سیاسی نظام پر نظر ڈالی جائے تب بھی اطمینان کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ سیاسی نظام میں ایسی بنیادی خرابیاں موجود ہیں، جنھوں نے اس کو خیر وفلاح کے بجائے شر اور فساد کا خادم بنادیا ہے۔ غیر منصفانہ قوانین، غیر معتدل پالیسیاں، قانون کے نفاذ میں جانب داری، طاقت ور عناصر کی قانون کی گرفت سے آزادی، حقوقِ انسانی کی پامالی اور جرائم پیشہ وسرمایہ دار طبقے کی مطلق العنانی موجودہ سیاسی نظام کی چند نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس صورت حال میں امتِ مسلمہ کے اُس جز کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں جس کا وطن ہندوستان ہے۔ امتِ مسلمہ کی مجموعی حیثیت یہ ہے کہ اُس کو پورے انسانی معاشرے کی عام اصلاح کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ چنانچہ امت کا کوئی حصہ جو دنیا کے کسی خاص خطے میں رہتا ہو، اُس کو بالخصوص اُس خطے کے اندر اپنی اصلاحی کوششیں انجام دینی ہوں گی۔ یہ اُس کا فطری دائرہ کار ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿١١٠﴾ (آل عمران:۱۱۰)

''تم (یعنی اُمتِ مسلمہ) سب اُمتوں سے بہتر ہو جو عالَم میں بھیجی گئی ہیں۔تم اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ اگر یہ اہلِ کتاب ایمان لاتے تو ان کے حق میں بہتر تھا۔اُن میں سے کچھ ایمان والے ہیں اور اکثر اُن میں نافرمان ہیں۔''

بنیادی سوال

امتِ مسلمہ کے باشعور افراد جب عملاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا آغاز کرتے ہیں تو ایک اہم سوال اُن کے سامنے یہ آتا ہے:

''سماج اور سیاسی نظام کے سیاق میں مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی اصلاحی کوششوں (یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر مشتمل سرگرمیوں) اور دوسرے سیاسی یا نظریاتی گروہوں کی جانب سے کی جانے والی اسی طرز کی کوششوں میں کوئی بنیادی فرق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا ہے؟''

کچھ لوگ اس طرح کے سوالوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اُن کے نزدیک اصل اہمیت میدانِ عمل میں انجام دی جانے والی سرگرمی کی ہے۔رہی یہ بات کہ اُس سرگرمی کی بنیاد کن تصورات وافکار پر ہے؟ تو ان کے خیال میں اس تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں۔لیکن سوچنے کا یہ انداز سطحی ہے اور اسلام کے حقیقت پسندانہ مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ بلاشبہ اسلامی مزاج عملی سرگرمیوں کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے، لیکن اُن سرگرمیوں کی پشت پر کارفرما محرکات وخیالات کو بھی وہ کم اہم نہیں سمجھتا۔ بالخصوص جہاں تک نیت کا سوال ہے، کسی عمل کی قدروقیمت متعین کرنے میں نیت کا رول بنیادی ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ''بلاشبہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔''

انسانی تصورات وخیالات ہی انسانی کاموں کی بنیاد ہیں اور اُن کا رخ متعین کرتے ہیں۔اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ جاننا ضروری ہے کہ اہلِ ایمان کی جانب سے انجام دی جانے والی اصلاحی سرگرمیوں کی وہ امتیازی خصوصیت کیا ہے جو اُن کوششوں کو دوسرے گروہوں کی کاوشوں سے ممتاز کرتی ہو؟ قرآن مجید میں مذکور اصلاحی مساعی کی مثالوں پر نظر ڈالی جائے تو

معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان کی اصلاحی سعی کی اصل امتیازی خصوصیت اس کی 'دینی اساس' ہے۔ بہ الفاظِ دیگر انبیاء علیہم السلام نے معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کا جو کام انجام دیا وہ اُن کے مشن سے غیر متعلق کوئی کام نہ تھا، بلکہ اُن کے اصل فریضے 'اقامتِ دین' کا ایک ناگزیر جز تھا۔ انبیاء کی پیروی کرتے ہوئے جو مخلص افراد اصلاح کا عزم لے کر اٹھیں، اُن کو اس امر کا اہتمام کرنا ہوگا کہ اُن کی اصلاحی سرگرمیاں دین کی بنیاد پر انجام پائیں۔

دینی اساس

جہاں تک متعین برائیوں کے مٹانے یا متعین بھلائیوں کو فروغ دینے کا معاملہ ہے، یہ کام سادہ انداز میں بھی انجام دیا جاسکتا ہے، یعنی کسی نظریے کا حوالہ دیے بغیر محض فطرتِ انسانی کی خیر پسندی کو اپیل کرتے ہوئے بھلائیوں کی تلقین اور بدی سے باز رہنے کی نصیحت کی جاسکتی ہے۔ اسلام اس طرزِ اصلاح کی نفی نہیں کرتا، البتہ یہ ظاہر ہے کہ یہ طرز، سماج میں رائج نسبتاً چھوٹی خرابیوں کی اصلاح میں تو کام یاب ہوسکتا ہے، اس لیے کہ وہ سماج میں عموماً اپنی گہری بنیادیں نہیں رکھتیں، لیکن بڑی خرابیاں اس طرح دور نہیں ہوسکتیں۔ سماج میں جو برائیاں بڑے پیمانے پر رائج ہوتی ہیں، اُن کو لوگ کسی نہ کسی نوعیت کا جواز فراہم کردیتے ہیں، تاکہ بُرے کام کرتے وقت ضمیر کی ملامت سے بچا جاسکے۔ ایسی برائیوں کو مٹانے کے لیے محض تلقین کافی نہیں ہوتی، بلکہ ان کے حق میں کیے جانے والے نظر فریب استدلال کی نفی بھی ضروری ہوتی ہے۔ یہ کام ایک پختہ و محکم نظریاتی اساس کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا۔

انبیاء علیہم السلام اور اُن کے مخلص پیروؤں نے اپنے اپنے دور میں معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کا جو کام انجام دیا، اُس کی اساس انھوں نے دین کو بنایا۔ اِس دینی اساس کے چند اہم پہلو یہ ہیں:

(الف) مصلح کی نیت کی درستگی

(ب) مصلح کی حیثیت (پوزیشن) کا تعارف

(ج) مخاطبین کے اندر جواب دہی کا احساس بیدار کرنا

(د) بشارت

(ہ) بدی کے لیے کیے جانے والے استدلال کی تردید

مندرجہ بالا پہلوؤں کی رعایت کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کی کوششوں کا نمایاں وصف اُن کی محنت، لگن، سنجیدگی اور قربانی ہے۔ اس وصف کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے کہ سماج یا نظام میں کوئی حقیقی تغیر واقع ہو سکے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے کہ بدی ناپائیدار ہوتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی صحیح ہے کہ اس شجرِ خبیث کی جڑیں ـــ کم زور ہی سہی ـــ لیکن بہ ہر حال زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ چنانچہ محض تمناؤں سے بدی اپنی جڑ نہیں چھوڑا کرتی۔ اس جڑ کو زمین سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے مسلسل کوشش درکار ہوتی ہے۔ انبیاء کے پیروؤں کو اس کا ثبوت دینا ہوگا کہ وہ برائیوں کے استیصال کے سلسلے میں سنجیدہ ہیں، تبھی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ حقائق کی اس دنیا میں اُن کی کوششیں کام یاب ہو سکیں گی۔

مصلحین کی نیت

آج کے جمہوری نظامِ سیاست میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے عوامی مقبولیت درکار ہوتی ہے۔ عوام کو لبھانے کے لیے اقتدار کے طالب افراد اور گروہ جو کوشش کرتے ہیں اس کا ایک نمایاں جز سماج یا نظام میں موجود زیادتیوں اور مظالم کے خلاف 'آواز اٹھانے' کا کام ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک بھلا کام ہے، لیکن اس کے پیچھے جو محرک کام کرتا ہے وہ محض اقتدار طلبی کا محرک ہے۔ اس پست محرک کے سبب عموماً اُن سیاسی گروہوں کو مسائل کے فی الواقع حل ہو جانے سے دل چسپی نہیں ہوتی۔ اُن کا مطمحِ نظر محض یہ ہوتا ہے کہ ان مسائل پر گفتگو چھیڑ کر اور مطالبات کر کے وہ اپنی عوامی مقبولیت میں اضافہ کر سکیں گے۔ بہ الفاظِ دیگر اقتدار کے طالب عناصر عوامی پریشانیوں اور مسائل کو اپنے اقتدار کے لیے زینہ سمجھتے ہیں۔ اس اندازِ فکر کے بالکل برعکس اُن مخلص مصلحین کا سوچنے کا انداز ہوتا ہے، جو اقتدار یا عوامی مقبولیت کے بجائے اللہ کی رضا کے لیے کام کرتے ہیں۔

ان خدا ترس مصلحین کا اصل منشا یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کی خرابی دور ہو جائے اور فساد مٹ جائے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اس امر کی جانب متوجہ کرتے ہوئے اپنی قوم کو ان الفاظ میں خطاب کیا:

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾

(ہود:۸۸)

''شعیب نے کہا: بھائیو! تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھُلی شہادت پر تھا اور پھر اُس نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا (تو اُس کے بعد میں تمھاری گم راہیوں میں تمہارا شریکِ حال کیسے ہوسکتا ہوں؟) اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں، اُن کا خود ارتکاب کروں۔ میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے۔ اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار، اللہ کی توفیق پر ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملے میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔''

شعیب علیہ السلام کے مندرجہ بالا ارشاد سے درجِ ذیل امور سامنے آتے ہیں:

(الف) انبیاء علیہم السلام جو اصلاح چاہتے ہیں، سب سے پہلے وہ خود اس پر عامل ہوتے ہیں۔ اُن کی دعوتِ اصلاح محض قولی نہیں، بلکہ عملی بھی ہوتی ہے۔

(ب) اُن کا اصل منشا اصلاح ہوتا ہے۔ اصلاحی مہم کے پیچھے مخلصانہ جذبۂ اصلاح کے علاوہ کوئی اور محرکات نہیں ہوتے۔

(ج) انبیاء علیہم السلام اس امرِ واقعی کا احساس رکھتے ہیں کہ انھیں ہدایت اللہ نے دی ہے۔ اللہ کے اس احسان کا شکر وہ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اپنی قوم کی گم راہیوں میں اس کے شریکِ حال نہیں بنتے۔

(د) یہ واقعہ ہے کہ اصلاح کے کام کی، فساد زدہ عناصر کی جانب سے مخالفت ہوتی ہے۔ اس صورتِ حال میں خدا ترس مصلحین کا اصل انحصار اللہ کی تائید و توفیق پر ہوتا ہے۔

انبیاء کی اصلاحی کوششوں کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ کارِ اصلاح کے لیے انسانوں سے کسی اجر کے طلب گار نہیں ہوتے۔ یہ بات قرآن مجید اکثر انبیاء کے تذکرے میں ہمارے سامنے لاتا ہے:

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ (ہود:۵۰-۵۱)

''اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، تمہارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ اے برادرانِ قوم! اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا۔ میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟''

انبیاء علیہم السلام جس طرح انسانوں سے کسی اجر کے خواہاں نہیں ہوتے اسی طرح وہ مخالفین کی دھمکیوں سے بھی بے نیاز ہوتے ہیں:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾ (یونس:۷۱)

''ان کو نوح کا قصہ سناؤ۔ اس وقت کا قصہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا: ''اے برادرانِ قوم! اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سُنا سنا کر تمھیں غفلت سے بیدار کرنا، تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے۔ تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو اور جو منصوبہ تمہارے پیش نظر ہو اس کو خوب سوچ سمجھ لو، تاکہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے۔ پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔''

جو لوگ اصلاحِ معاشرہ کا کام انبیائی طرز پر کرنا چاہتے ہیں، ان کو چاہیے کہ محض اصلاحِ حال کو اپنا مقصود بنائیں، انسانوں سے کسی اجر کے طالب نہ ہوں اور اُن کی مخالفت اور

دھمکیوں کے علی الرغم، اللہ کے بھروسے پر کام کیے جائیں۔اسی صورت میں وہ اللہ کی تائید کی توقع رکھ سکتے ہیں۔

مصلح کی حیثیت

انبیاء علیہم السلام اپنی اصلاحی مساعی کی ابتدا کرتے ہوئے اللہ کے پیغمبر کی حیثیت سے اپنا تعارف کراتے ہیں۔مثال کے طور پر صالح علیہ السلام کے دعوتی مشن کا تذکرہ ہمیں قرآن مجید میں ملتا ہے:

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ (الشعراء:۱۴۲-۱۴۴)

"یاد کرو جب اُن کے (یعنی قومِ ثمود کے) بھائی صالح نے اُن سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔"

نبیوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے جو اہلِ ایمان دعوتِ حق کے لیے اٹھیں، ان کو بھی اپنا تعارف کرانا چاہیے کہ وہ 'مسلم' (اللہ کے فرماں بردار) ہیں:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۳۳﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۳۳)

"اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصلحین کی حیثیت کا یہ اعلان کیوں ضروری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر سنجیدہ دعوتِ اصلاح، فطری طور پر نظامِ اطاعت میں تبدیلی کا مطالبہ کرتی ہے۔مصلحین کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ جن مفسد افراد کی اطاعت کر رہا ہے، ان کی اطاعت سے باز آجائے۔اُن کے بجائے وہ اللہ کے رسولوں کی اطاعت اختیار کر لے۔اگر نظامِ اطاعت میں تبدیلی کا یہ

مطالبہ نہ کیا جائے اور معاشرے میں مفسد عناصر کی اطاعت بدستور جاری رہے تو بدی کو مٹانے کی کوئی کوشش کام یاب نہیں ہوسکتی۔

چنانچہ انبیائی اسوے کی روشنی میں کارِ اصلاح کے لیے دو کوششیں بہ یک وقت درکار ہوتی ہیں: ایک طرف یہ ضروری ہے کہ لوگوں کے اندر خیر کی طلب اور بدی سے نفرت پیدا کی جائے، تاکہ معاشرے میں معروف کو فروغ حاصل ہو اور منکر مٹ سکے۔ دوسری طرف یہ لازم ہے کہ مفسدین کی اطاعت کے بجائے معاشرے کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ صالحین کی اطاعت کرے۔ گویا فکرونظر کی اصلاح کے ساتھ ساتھ عملاً موجود نظامِ اطاعت کی اصلاح پر توجہ مرکوز کرنا بھی ضروری ہے، تبھی اصلاحی کوششیں نتیجہ خیز ہوسکتی ہیں۔

جواب دہی کا احساس

انسان منکرات سے کیوں بچے اور معروفات پر کیوں عمل پیرا ہو؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ انبیاء اس سوال کا جواب فراہم کرتے ہیں۔ یہ جواب ذیل کے نکات پر مشتمل ہے:

(الف) منکر کو انسانی فطرت ناپسند کرتی ہے اس لیے منکر سے بچنا فطرت کا تقاضا ہے۔

(ب) اللہ نے انسان کو ذمہ دار ہستی بنایا ہے۔ اس کے مقامِ بلند کا تقاضا ہے کہ وہ منکر سے باز رہے۔

(ج) اس دنیا کے بعد آخرت کا مرحلہ آنے والا ہے، جہاں انسان کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہوگا۔ آخرت میں اللہ کی گرفت سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی برائیوں سے پرہیز کرے۔

درج بالا نکات کا تقابل اُس طرزِ گفتگو سے کیا جاسکتا ہے جو آج کل اُن لوگوں کے درمیان مقبول ہے، جو ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ 'ظلم وزیادتی کیوں نہ ہو؟' اس کے جواب میں اُن کی جانب سے درج ذیل باتیں کہی جاتی ہیں:

(الف) ملک کو متحد رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں ظلم نہ ہو۔

(ب) ظلم وزیادتی کی صورت میں مظلوم طبقات کے ردِعمل کا اندیشہ ہے، اس لیے زیادتی سے باز رہنا چاہیے۔

(ج) دستور و قانون یہ تقاضا کرتے ہیں کہ زیادتی نہ کی جائے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سب جوابات بہت کم زور جوابات ہیں اور غلط طرزِ عمل سے انسانوں کو باز رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ جو مصلحین فی الوقع منکرات کو ختم کرنا چاہتے ہیں، اُن کو ایسے کم زور محرکات کا سہارا لینے کے بجائے انسانوں کے اندر احساسِ ذمہ داری اور احساسِ جواب دہی پیدا کرنا ہوگا، جو خدا اور آخرت پر ایمان سے وجود میں آتا ہے۔

منکرات سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے فطرتِ انسانی سے استدلال کی ایک مثال بدکاری سے دور رہنے کی قرآنی ہدایت ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾ (بنی اسرائیل:۳۲)

''زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔''

منکر چوں کہ فطرتِ انسانی سے بغاوت ہے، اس لیے اُس کی ایک پہچان یہ ہے کہ انسانی معاشرے کی بڑی اکثریت اسے برا سمجھتی ہے۔ بعض برائیاں وہ ہیں کہ جب معاشرہ اصلاح یافتہ ہوتا ہے تو لوگ اُن سے یکسر ناواقف ہوتے ہیں۔ پھر بعض بدطینت لوگ اس برائی کا آغاز کر دیتے ہیں۔ ایسی برائیوں کا خلافِ فطرت ہونا واضح ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو بے حیائی سے باز آنے کی تلقین کرتے ہوئے اس پہلو کی طرف توجہ دلائی:

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾

(الاعراف:۸۰-۸۱)

''اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا: ''کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو، جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟''

منکر کے خلاف انبیائی استدلال کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ منکر سے بچنا انسان کے مقامِ بلند کا تقاضا ہے اور اللہ کے احسانات کا شکر بھی یہی ہے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٧٤﴾ (الاعراف:۷۴)

"(صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا) یاد کرو جب اللہ نے قومِ عاد کے بعد تم کو خلیفہ بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج اس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اس کے احسانات کو یاد کرو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔"

عرب کے جاہلی معاشرے کی چند نمایاں خرابیاں یہ تھیں:

(الف) یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بُرا سلوک

(ب) نوزائیدہ بچیوں کا قتل — اور

(ج) ناپ تول میں کمی۔

قرآن مجید نے ان برائیوں کی شدید مذمت کی ہے اور عالمِ آخرت کے حوالے سے کی ہے۔ اس نے پُرزور تلقین کی ہے کہ انسان آخرت کی جواب دہی کو یاد رکھے۔ درجِ ذیل آیات اس حقیقت پر روشنی ڈالتی ہیں:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ﴿١﴾ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ﴿٢﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿٣﴾

(الماعون:۱-۳)

"تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔"

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ﴿٨﴾ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴿٩﴾ (التکویر:۸،۹)

"(اور روزِ حشر) جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟"

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ① الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ② وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ③ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ④ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑤ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑥ (المطففین:۱-۶)

”تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے، جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب اُن کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انھیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس دن جب کہ سب لوگ اللہ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔“

بشارت

آخرت کی جواب دہی کا احساس تازہ کرنا انبیائی خطاب کا ایک پہلو ہے۔ انبیاء اپنے مخاطبین کو بتاتے ہیں کہ اچھا طرزِ عمل اللہ کے اجر اور فضل کا موجب ہے اور اس کے برعکس منکر پر عمل انسان کو اللہ کے غضب اور سزا کا مستحق بناتا ہے۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ تنبیہ اور بشارت کے ان دونوں پہلوؤں کا تعلق آخرت کے علاوہ خود موجودہ دنیوی زندگی سے بھی ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے اس حقیقت کی جانب متوجہ کیا ہے:

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ⑤٢ (ہود:۵۲)

”اور (ہود علیہ السلام نے کہا) اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو۔ وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمھاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو۔“

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"(اللہ تمھاری) مالی اور بدنی قوت بڑھائے گا، اولاد میں برکت دے گا، خوش حالی میں ترقی ہوگی اور مادی قوت کے ساتھ روحانی و ایمانی قوت کا اضافہ کردیا جائے گا۔ بشرطے کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہوکر، اس کی اطاعت سے مجرموں کی طرح روگردانی نہ کرو۔"

حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو تنبیہ کے پہلو بہ پہلو اچھے طرزِ عمل پر اللہ کے فضل و کرم کی بشارت دی:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝۱۱ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝۱۲ (نوح:۱۰-۱۲)

"(نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا) میں نے (اپنی قوم سے) کہا: اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کردے گا۔"

تنبیہ و بشارت اصلاحی سعی کے دو ایسے پہلو ہیں جو اس کوشش کے دینی مزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا گفتگو سے جو نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں وہ درجِ ذیل ہیں:

(الف) سماج اور سیاسی نظام کی اصلاح کے لیے امتِ مسلمہ کی جانب سے جو کوشش کی جائے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے طرز پر ہونی چاہیے۔

(ب) معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کا یہ کام دینی بنیادوں پر انجام دیا جانا چاہیے۔ دینی بنیادوں پر یہ مہم چلائی جائے تو وہ 'دعوتِ اسلامی' سے ہم آہنگ ہوگی۔ اس کے برعکس اگر سماجی و سیاسی تغیر و اصلاح کے لیے کوشش دینی اساس پر نہ ہو تو دعوتِ اسلامی سے اس کا کوئی جوڑ نہ ہوگا۔ اس صورت میں اندیشہ ہے کہ دینی بنیادوں سے بے تعلق ایسی کوششیں اسلام کی دعوت کے بارے میں غلط فہمیوں کا باعث بن جائیں گی۔